379 | ستمبر 2017

ملّتِ اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلّہ

# مُحدّث

مُدیر اعلیٰ

ڈاکٹر حافظ عبد الرحمٰن مدنی حفظہ اللہ

مُدیر

ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

4 ایک مجلس کی تین طلاقیں اور بھارتی سپریم کورٹ کا فیصلہ

24 سیدنا عیسیٰ الٰہ تھے، یا نبی؟ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی

47 دہشت گردانہ طرزِ فکر کے مغالطے اور ان کی وضاحت

63 امریکہ کا سفید جھوٹ اور عراق کی بربادی

جامعۃ لاہور الاسلامیۃ

ISLAMIC RESEARCH COUNCIL
PAKISTAN

مجلس التحقیق الاسلامی

ماہنامہ محدث لاہور

## ماہنامہ 'محدث' لاہور کا اجمالی تعارُف

**مُدیرِ اعلیٰ:** حافظ عبدالرحمٰن مدنی  **مُدیر:** ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

ماہنامہ 'محدث' لاہور، ہندوستان سے نکلنے والے ایک رسالے کی ہی ارتقائی شکل ہے۔ جامعہ رحمانیہ دہلی سے نکلنے والے رسالے - جس کا نام محدث تھا- کو پروان چڑھاتے ہوئے تقسیمِ ہند کے بعد دوبارہ ماہنامہ 'محدث' لاہور کے نام سے پاکستان میں معروف عالم دین ودانشور حافظ عبدالرحمٰن مدنی حفظہ اللہ نے اس کا اِجراء کیا۔ یہ تحقیقی رسالہ ۱۹۷۰ء سے اب تک کامیابی وکامرانی سے شائع ہورہا ہے، وللہ الحمد!

محدث کی علمی پہچان کے حوالے سے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ ہر صاحبِ علم وفضل کی ضرورت بن چکا ہے کیونکہ اس کے مضامین جدید فکر کے حامل اور ملحدانہ افکار کیلئے شمشیر بے نیام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

## گھر بیٹھے 'محدث' وصول کیجئے!

قارئین کرام! گھر بیٹھے محدث حاصل کرنے کیلئے درج ذیل طریقہ کار اختیار کریں!

**فی شمارہ:** ۲۰روپے  **زرِ سالانہ:** ۲۰۰روپے **بیرون ملک:** ۲۰ڈالر

بذریعہ منی آرڈر/بینک ڈرافٹ ۲۰۰روپے بھیج کر سال بھر گھر بیٹھے محدث وصول کریں اور علمی وتحقیقی مضامین سے استفادہ کریں۔  **ایڈریس:** ماہنامہ محدث، ۹۹جے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۵۴۷۰۰

**فون نمبر:** 35866476 / 042 - 3586639  **موبائل:** 0305 - 4600861

انٹرنیٹ پر محدث پڑھنے اور ڈاؤن لوڈ کرنے کیلئے درج ذیل ویب سائٹ دیکھئے!

www.kitabosunnat.com __ www.mohaddis.com

مزید تفصیلات کیلئے: webmaster@kitabosunnat.com

## اجرائے مُحدث کے مقاصد

- عناد اور تعصّب قوم کیلئے زہر ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں!
لیکن تعصّبات سے بالاتر رہ کر افہام و تفہیم اُمت کیلئے رحمت کا باعث ہے۔

---

- علومِ جدیدہ سے ناواقفیت اور انکار، انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں!
لیکن قدیم علومِ اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دَقیانوس بتانا اُمت کی تباہی کا سبب ہے۔

---

- غیر مذاہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اَقدار کے منافی ہے!
لیکن دینِ اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سر انجام نہ دینا حمیت دینی اور غیرتِ اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔

---

- تبلیغ دین اور اشاعت اسلام میں حکمتِ عملی کو نظر انداز کر دینا مصالح دینیہ کے خلاف ہے!
لیکن حلال اور حرام کے امتیاز میں رَواداری برتنا اور قوانین و مسائل اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی روح کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔

---

- آئین و سیاست سے بیگانہ ہر کر عبادت کیلئے گوشہ نشین ہو جانا زندگی سے فرار ہے!
لیکن جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔

---

- جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عبادِ صالحین کے اَوصاف میں داخل ہے!
لیکن جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔

اگر آپ ایسا منصفانہ اور معتدلانہ رویہ پسند کرتے ہیں تو

ماہنامہ محدث لاہور

کا مطالعہ فرمائیے، آپ اس کو ان جملہ صفات و محاسن سے مزین پائیں گے، ان شاء اللہ!
کیونکہ اس کے مضامین اسی مخصوص طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔

ملتِ اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ

# ماہنامہ محدث لاہور پاکستان

مدیر اعلیٰ
ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی ﷾

مدیر
ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

جلد 49 ستمبر 2017ء / ذوالحجہ 1438ھ عدد 05

مجلس مشاورت
▪ حافظ صلاح الدین یوسف ▪ ڈاکٹر محمد حماد لکھوی ▪ ڈاکٹر محمد اسحاق زاہد
▪ ڈاکٹر حافظ انس مدنی ▪ ڈاکٹر حافظ حمزہ مدنی ▪ ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

## فہرست مضامین


فکر ونظر — حافظ صلاح الدین یوسف ؒ
ایک مجلس کی تین طلاقیں اور بھارتی سپریم کورٹ کا فیصلہ (4)


دار الافتاء — ڈاکٹر حافظ عبد الرحمن مدنی
لاپتہ خاوند کا انتظار کب تک کیا جائے؟ (20)


ادیان وملل — مولانا خاور رشید بٹ
سیدنا عیسیٰ الٰہ تھے، یا نبی؟ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی (24)


فقہ و اجتہاد — ڈاکٹر شیخ عبد الرحمن السدیس ﷾
دہشت گردانہ طرزِ فکر کے مغالطے اور ان کی وضاحت (47)


ملت اسلامیہ — ڈاکٹر حافظ حسن مدنی
امریکہ کا سفید جھوٹ اور عراق کی بربادی (63)

نائب مدیر
محمد نعمان فاروقی

ترسیل
محمد اصغر 0305 4600861

زر سالانہ =/300 روپے
فی شمارہ =/60 روپے

بیرون ملک
زر سالانہ =/20 ڈالر
فی شمارہ =/4 ڈالر

Monthly Muhaddis
A/c No: 984-8
UBL-Model Town
Bank Squre Market, Lahore.

دفتر کا پتہ
99 جے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700
042-35866396, 35866476
Email:
Mohaddislhr@gmail.com

Publisher:
Hafiz Abdur Rahman Madni
Printer:
Shirkat Printing Press, Lahore.

Islamic Research Council

محدث کتاب و سنت کی روشنی میں آزادانہ بحث وتحقیق کا حامی ہے لہٰذا ادارہ کا مضمون نگار حضرات سے کلی اتفاق ضروری نہیں!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فکر و نظر

# ایک مجلس کی تین طلاقیں
## اور بھارتی سپریم کورٹ کا فیصلہ

### فقہی جمود نے غیروں کو جگ ہنسائی کا موقع دے دیا!! إنا للہ وإنا إلیہ راجعون

ایک مجلس کی تین طلاقوں کا مسئلہ اگرچہ صدیوں سے مختلف فیہ چلا آرہا ہے لیکن جب تک اسلامی یا مسلمان معاشروں میں شریعت پر عمل کا جذبہ توانا، مرد اور عورت کے باہمی حقوق کی پاسداری کا خیال فراواں اور ہمدردی و تعاون کا سکہ رواں رہا، اس مسئلے نے زیادہ گھمبیر شکل اختیار نہیں کی تھی، اس لئے اس کی کٹھنائیاں بھی زیادہ سامنے نہیں آئیں۔ لیکن اب صورتِ حال سالہا سال سے کافی مختلف ہے۔ اب مسلمانوں کی اکثریت جہاں ایک طرف اسلامی تعلیمات سے نابلد ہے تو دوسری طرف صبر و تحمل سے بھی عاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے طلاق کی شرح برائے نام تھی تو اب اس کی شرح آسمانوں سے باتیں کرتی نظر آتی ہے۔ پھر ستم بالائے ستم یہ فقہی جمود کہ عام لوگوں کی جہالت کی وجہ سے تو ہزاروں گھر اُجڑ گئے اور اُجڑ رہے ہیں اور پتہ نہیں کب تک اُجڑتے رہیں گے لیکن عوامی اکثریت کے حامل حنفی علما اس صورتحال پر سنجیدہ غور و فکر کرنے سے گریزاں ہیں۔ اُجڑتے گھرانے اور بڑھتے مسائل آئے روز ان کی نظروں کے سامنے آتے ہیں لیکن وہ کوئی شرعی گنجائش دینے کو آمادہ نہیں۔ جس چیز کا حل شریعتِ اسلامیہ میں موجود ہے حتی کہ فقہ حنفی میں بھی اس کے بعض شرعی متبادل پائے جاتے ہیں لیکن ایسے متوازن حل کی طرف پیش قدمی کی بجائے حلالہ کا ناجائز اور بے غیرتی پر مبنی راستہ دکھادیا جاتا ہے۔ اس طرح حنفی علمانے اپنے معتقدین کے لئے آسانی کی بجائے ایک مشکل ترین راستے کو منتخب کر رکھا ہے۔ جو عورت ایک بار اِن مسائل کا شکار ہو جائے تو بے شک اس کا گھر اُجڑ جائے، اس کے بچے رُل جائیں، خود وہ عورت بے آسرا اور بے سہارا ہو کر دربدر کی ٹھوکریں کھائے لیکن ان تقدس مآبوں کے دل نہیں پسیجتے، ان کے دکھوں اور دردوں کا کوئی درماں ان کے پاس نہیں ہے، اُن کے رِستے زخموں کے لئے ان کے پاس کوئی پھاہا نہیں ہوتا۔

کیا یہ اسلامی یا مسلمان معاشرے کی اچھی تصویر ہے...؟

یا خدانخواستہ اسلام کا نظامِ طلاق ایسا بے رحمانہ اور ظالمانہ ہے...؟

کیا اسلام میں مذکورہ مظلوم عورتوں اور بچوں کا کوئی حل نہیں ہے...؟

کیا ایک مسلمان کی جہالت کا ازالہ 'بے غیرتی' (حلالہ) اختیار کئے بغیر نہیں ہو سکتا؟

ہمارے یہ چار سوال ان علماء سے ہیں جو فقہی جمود میں اس طرح مگن ہیں کہ ان مسائل کے حل کی طرف ان کی توجہ ہی نہیں جاتی۔

ہم عرض کریں گے کہ اسلام وہ پہلا مذہب ہے جس نے سب سے پہلے عورتوں پر ہونے والے مظالم کا خاتمہ کیا تھا، ان کو عزت و احترام کا اعلیٰ مقام عطا کیا تھا، وہ اس ظلم و ستم کا روادار کب ہو سکتا ہے جو مسئلۂ طلاقِ ثلاثہ کے نام پر مذہبی قیادت کی طرف سے عورتوں پر رَوا رکھا جا رہا ہے۔ ان حضرات کے اس رویے سے اسلام پر ایسے بدنما اعتراضات اُٹھ جاتے ہیں جن کی وضاحت ممکن نہیں رہتی۔ اسلام کے نظامِ طلاق میں قطعاً ایسی کوئی بات نہیں جس سے مسلمان عورت پر ظلم کا دروازہ کھلے۔ البتہ اس میں دو عنصر ایسے ہیں جو اسلام کی بدنامی کا باعث ہیں:

ایک، اسلام نے مرد کو جو طلاق کا حق دیا ہے، جو بڑی حکمتوں پر مبنی ہے، مسلمان مرد اپنے اس حق طلاق کو غلط طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔

دوسرے، وہ علماء ہیں جو طلاق کے غلط طریق استعمال سے ہونے والی کوتاہیوں کا ازالہ کرنے کی کوئی فکر نہیں کرتے۔ اگر ان دونوں کا رویہ صحیح ہو جائے یا کم از کم دونوں میں سے کوئی ایک ہی اپنا رویہ ٹھیک کر لے تو یہ مسئلہ نہایت آسانی سے حل ہو جاتا ہے۔

① پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو طلاق کا حق اس لئے نہیں دیا کہ وہ اس کو غلط طریقے سے استعمال کر کے عورت پر ظلم کرے اور ذرا ذرا سی بات پر طلاق دے ڈالے[1]۔ بلکہ گھر کا نظام مستحکم طریقے سے چلانے کے لئے مرد کو حاکمیت کا جو مقام عطا کیا گیا ہے، حق طلاق بھی اس کا ایک حصہ ہے۔

② بدقسمتی سے مسلمان عوام میں اسلامی تعلیمات کا یہ شعور بالعموم نہیں ہے لیکن علماء کو تو باشعور ہونا چاہئے تاکہ وہ عوام کی جہالت کا ازالہ 'خرابیٔ بسیار' سے پہلے ہی کر لیں اور ایسا کرنا کوئی مشکل بات بھی نہیں ہے۔ صرف فقہی جمود کے بجائے فقہی توسع کی اور شریعت کی عطا کردہ سہولتوں سے عوام کو بہرہ ور کرنے کی

---

1 اس کی تفصیل راقم کی کتاب 'ایک مجلس کی تین طلاقیں اور اس کا شرعی حل' ناشر: دارالسلام، لاہور میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

ضرورت ہے۔

عوام تو کالأنعام ہوتے ہیں، ان کو سمجھانا مشکل ہے، نیز ان کی تعداد بھی علماء کے مقابلے میں بے انتہا ہے، ان سب تک رسائی ناممکن ہے۔ اگر علماء اس کو سمجھ لیں اور ان کے دل عوام کی خیر خواہی کے جذبوں سے معمور ہوں تو یہ مسئلہ آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔

ہم پورے شرحِ صدر اور نہایت یقین و اذعان سے یہ بات کہتے ہیں کہ ہم مسئلے کا جو حل پیش کریں گے، اس میں دائرۂ شریعت سے قطعاً تجاوز نہیں ہو گا بلکہ فقہی جکڑ بندیوں سے بھی باہر نکلنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، کیونکہ بہت سے حنفی علما انہی فقہی پابندیوں میں ہی جینا چاہتے ہیں۔

## موجودہ حالات میں ایک مجلس کی تین طلاقوں کا صحیح حل

مسلمان عوام کی جہالت، بے صبری و عدم تحمل اور طریقۂ طلاق سے بے شعوری کی وجہ سے مسلمان عورتوں اور بچوں پر جو ظلم ہو رہا ہے، اس کے ازالے کا ایک ہی طریقہ اور اس مرض کا ایک ہی علاج ہے کہ بیک وقت دی گئیں تین طلاقوں کو ایک طلاقِ رجعی قرار دیا اور تسلیم کر لیا جائے تاکہ عدت کے اندر رجوع اور عدت گزرنے کی صورت میں نئے نکاح کے ذریعے سے ٹوٹا ہوا تعلق بحال ہو جائے۔ یوں بے شمار گھر اُجڑنے سے اور بچے بے سہارا ہونے سے بچ جائیں گے۔

یہ حل قرآن و حدیث کی تعلیمات کے مطابق ثابت شدہ بھی ہے اور اس کے اختیار کرنے سے مذہبِ حنفی سے خروج بھی لازم نہیں آتا۔ اس کی مکمل تفصیل اور دلائل راقم کی کتاب 'ایک مجلس میں تین طلاقیں' نامی کتاب میں موجود ہیں، یہاں صفحات کی تنگ دامانی اس کے بیان کرنے سے مانع ہے۔

یہ دلائل الحمدللہ اتنے قوی ہیں اور موجودہ حالات کے تناظر میں ان کی صحت بھی اتنی یقینی ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے متعدد حنفی علما نے بھی ان سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے فتووں، مقالات اور سیمیناروں میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ مجلس واحد کی تین طلاقوں کو ایک طلاق شمار کر کے رجوع اور صلح کا حق دینا شرعاً بالکل صحیح ہے اور یہ دیا جانا چاہیے۔

## ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک طلاق تسلیم کرنے والے بھارتی حنفی علماء کے اسمائے گرامی

بھارت کے جن حنفی علما نے اس موضوع پر اپنے نتائج مطالعہ و تحقیق پیش کیے ہیں، اور ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک طلاق شمار کرنے پر زور دیا ہے، ان میں سے چند نمایاں نام حسب ذیل ہیں:

| | |
|---|---|
| ① مولانا ابو الکلام آزاد | |
| ② مولانا سعید احمد اکبر آبادی | مدیر ماہنامہ 'برہان' دہلی |
| ③ مولانا عروج احمد قادری | مدیر ماہنامہ 'زندگی' رامپور |
| ④ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن | صدر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت |
| ⑤ مولانا حامد علی | سیکرٹری جماعتِ اسلامی، ہند |
| ⑥ مولانا شمس پیرزادہ | ممبئی |
| ⑦ مولانا محفوظ الرحمٰن قاسمی | فاضل دیوبند |
| ⑧ مولانا وحید الدین خان | |
| ⑨ مولانا سلطان احمد اصلاحی | |
| ⑩ مولانا سید سلمان الحسینی الندوی | |
| ⑪ مولانا الطاف احمد اعظمی | |
| ⑫ مولانا عنایت اللہ اسد سبحانی | ڈائریکٹر کلیۃ القرآن، کیرالہ |
| ⑬ مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلالی | مالیر کوٹلہ (ماہنامہ 'الشریعہ' گوجرانوالہ) |
| ⑭ مولانا ابو الحسنات ندوی | رفیق دار المصنفین، اعظم گڑھ وغیرہم |

بعض علما وہ ہیں جنہوں نے اہلحدیث علما سے فتوے حاصل کر کے رجوع کرنے کا جواز تسلیم کیا ہے۔ ان میں

⑮ مولانا عبد الحئ لکھنوی

⑯ مفتیٔ اعظم ہند مولانا مفتی کفایت اللہ مرحوم جیسے کبار علما شامل ہیں۔

## پاکستانی علمائے احناف اور اہل فکر و دانش

| | |
|---|---|
| ⑰ پیر کرم شاہ الازہری | بھیرہ |
| ⑱ مولانا عبد الحلیم قاسمی | جامعہ حنفیہ قاسمیہ گلبرگ، لاہور |
| ⑲ حافظ حسین احمد قاسمی | جامعہ حنفیہ گلبرگ، لاہور |
| ⑳ مولانا حسین علی | واں بھچراں |
| ㉑ مولانا یٰسین شاہ | فاضل دیوبند، جھنگ |

| | |
|---|---|
| ㉒ مولانا احمد الرحمٰن | خطیب جامع مسجد، پاک سیکرٹریٹ، اسلام آباد |
| ㉓ پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم وِرک | گورنمنٹ کالج قلعہ دیدار سنگھ گوجرانوالہ |
| ㉔ ڈاکٹر رضوان علی ندوی | کراچی |
| ㉕ ڈاکٹر مفتی غلام سرور قادری | دار العلوم رضویہ، ماڈل ٹاؤن لاہور |
| ㉖ مولانا مفتی محمد زاہد | شیخ الحدیث جامعہ امدادیہ فیصل آباد (ان کا فتویٰ نشے کی حالت میں عدم طلاق کا ہے جس کے اکثر احناف قائل نہیں۔) |
| ㉗ مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم | دار العلوم کراچی |
| ㉘ جناب عمار خان ناصر | مدیر ماہنامہ 'الشریعہ' گوجرانوالہ |
| ㉙ ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی | ہائی ٹیک یونیورسٹی، ٹیکسلا وغیرہم |

برصغیر پاک وہند کے مذکورہ تمام علماے احناف کے فتاویٰ، مقالات اور آرا راقم کی کتاب 'ایک مجلس کی تین طلاقیں اور اس کا شرعی حل، مشاہیر اُمت اور پاک وہند کے متعدد علمائے حنفیہ کی نظر میں' موجود ہیں۔ یہ کتاب دار السلام لاہور سے ۲۰۰۷ء میں چھپی ہوئی مارکیٹ میں موجود ہے۔

ان سب کے اقتباسات تو اس مضمون میں نہیں دیئے جاسکتے، چند آراء ذکر کی جاتی ہیں، باقی آراء کتاب میں دیکھی جاسکتی ہیں:

① ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی (فیکلٹی آف اسلامک سٹڈیز، ہائی ٹیک یونیورسٹی، ٹیکسلا) اسی بھارتی سپریم کورٹ کے زیر بحث مسئلے سے متعلق فیصلے پر گفتگو کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں، یاد رہے کہ موصوف پختہ حنفی ہیں:

"اس سماجی تفاوت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سماج میں طلاق کی صورت میں سزا مرد کو نہیں، بیوی کو ملتی ہے۔ مزید یہ کہ جہالت، دین سے بے بہرہ ہونے اور اُجڈ پن کی وجہ سے طلاق چونکہ اچانک اور یکبارگی تین دے دی جاتی ہیں، جو ایک خاندان، دو گھرانوں اور بچوں کے لئے تباہ کن ہوتی ہے۔ ایسے میں یکبارگی تین طلاق کو نافذ کرنا مجرم کو سزا دینا نہیں بلکہ مظلوم پر مزید ظلم کرنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا ہماری رائے یہ ہے کہ حالات وزمانے کی تبدیلی کی رعایت کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے سماج میں یکبارگی دی جانے والی تین طلاقوں کو ایک قرار دیا جائے۔ جیسا کہ عہدِ نبوی اور عہدِ صدیقیؓ اور عہد فاروقیؓ کے ابتدائی دو سالوں میں یہی قانون تھا۔ نیز کئی ایک صحابہ کرامؓ، تابعین اور ائمہ کرام کی بھی یہی رائے ہے۔ نیز اگر حکومت مختلف فقہی آراء میں سے کسی ایک رائے کو قانون کا درجہ دے دے تو

وہ رائے مرجوح ہو، تب بھی فتویٰ اور فیصلے اسی کے مطابق کئے جائیں گے۔"[1]

② مولانا سلطان احمد اصلاحی، ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ کے نہایت اہم رکن ہیں۔ مسلکاً حنفی ہیں، لیکن اللہ نے فقہی جمود سے ہٹ کر سوچنے کی توفیق سے نوازا ہے۔ طلاقِ ثلاثہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"سرفہرست مسئلہ طلاقِ ثلاثہ کا ہے۔ ہندوستان کے موجودہ حالات میں مصلحت اس کی متقاضی ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاق کو ایک ہی تسلیم کیا جائے۔ ضرورت کے تقاضے سے اگر مفقود الخبر کے مسئلے میں مالکیہ کے مسلک پر شرحِ صدر سے عمل کیا جارہا ہے تو اس طرح کی ضرورت سے اگر اس مسئلے میں بھی مسلکِ اہل حدیث کو اختیار کرلیا جائے تو یہ کوئی گناہ اور کسی جرم کا ارتکاب نہیں ہوگا۔ حلالے کا حیلۂ شرعی آج کے تنقیدی اور سوالیاتی دور میں اس دین کی بدنامی کا باعث ہے۔ اس برائی کے ارتکاب سے بہت بہتر ہے کہ اُمت کے ایک معتبر فقہی دھارے کی رخصت اور رعایت سے فائدہ اُٹھالیا جائے۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھے جائیں خاکسار کے دو مضامین: 'مسئلہ طلاق، متوازن نقطۂ نظر' اور 'مسئلہ طلاق، بعض ملاحظات' مطبوعہ سہ روزہ 'دعوت' دہلی۔ نیز پندرہ روزہ 'ترجمان' اہل حدیث دہلی۔ اس سلسلے میں علماے ملت سے اسی قدر گزارش کی جاسکتی ہے کہ وہ اسے مسلکی اَنا کا مسئلہ بنانے کی بجائے اسلام، اُمت اور دعوت کے پس منظر میں دیکھیں اور اللہ کے دین کو بدنام ہونے سے بچائیں۔"[2]

③ ایسے ہی ماہ نامہ 'الشریعہ' کے مدیر جناب عمار خاں ناصر اپنے ایک مضمون بعنوان 'معاشرہ، قانون اور اخلاقیات' نفاذِ شریعت کی حکمتِ عملی کے چند اہم پہلو' میں تحریر کرتے ہیں:

"ایک ایسا معاشرہ جہاں لوگوں کی اکثریت طلاق کے شرعی طریقے اور اس کی حکمتوں سے ناواقف ہو، جہاں معاشرتی، معاشی مشکلات ومسائل نے لوگوں سے صبر وحوصلہ اور تحمل چھین کر اُنہیں ذہنی تناؤ کا مریض بنادیا ہو، جہاں مطلقہ عورت کے لئے باعزت زندگی گزارنا یا عقدِ ثانی کرنا بے حد مشکل ہو اور طلاق مرد کی بجائے حقیقت میں عورت کے لئے سزا قرار پائے، کیا ایسے معاشرے میں ایک مجلس کی تین طلاقوں کو لازماً نافذ قرار دینا حکمت ومصلحت پر مبنی شریعت کا منشا ہوگا اور کیا اس سے اللہ تعالیٰ کی

---

۱ ماہنامہ 'الشریعہ' گوجرانوالہ، اکتوبر ۲۰۱۷ء: ص ۳۴

۲ مجموعۂ مقالات، سیمینار 'علوم الحدیث، مطالعہ وتعارف': ص ۲۲۶، ۲۳۱

مقرر کردہ حدود کو پامال کرنے کی سزا فی الواقع اس کے اصل مجرم یعنی شوہر ہی کو ملے گی۔"[1]

موصوف کے اس اقتباس سے واضح ہے کہ وہ اپنے ہم مسلک علماے احناف بلکہ اپنے دادا مرحوم کے موقف کو کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی واقع ہو جاتی ہیں، شریعت کی حکمت و مصلحت کے خلاف سمجھتے ہیں۔

## مسئلہ زیر بحث، مذاہبِ اربعہ کی روشنی میں

برصغیر پاک و ہند کے جن علماے احناف نے طلاقِ ثلاثہ کے ایک طلاق رجعی ہونے کا موقف اختیار کیا ہے، وہ قرآن و حدیث کی تصریحات کے تو مطابق ہے ہی لیکن اس میں ائمہ اربعہ کے مسلک سے بھی انحراف نہیں پایا جاتا جن کی بابت یہ دہائی دی جاتی ہے کہ ان کے متفقہ مسلک سے انحراف کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ لیجئے! ائمہ اربعہ اور مذاہب اربعہ کا موقف بھی ذیل میں ملاحظہ فرمالیں:

## مذاہب اربعہ کا متفقہ موقف... تاکید کے طور پر "تین طلاقیں، ایک ہی طلاق ہے!"

چاروں فقہوں (حنفی، حنبلی، شافعی اور مالکی) میں ایک اور نقطۂ نظر سے بھی تین دفعہ طلاق کا لفظ دہرانے کے باوجود اسے ایک طلاق شمار کرنے کی گنجائش موجود ہے، حالانکہ یہ سب اصحابِ فقہ ایک وقت کی تین طلاقوں کو تین ہی شمار کرنے کے قائل ہیں۔

چنانچہ کتاب الفقه على المذاهب الأربعة کے مؤلف فقہ مالکی کی صراحت کرتے ہیں:

## فقہ مالکی کا فتویٰ

**الصورة الأولىٰ**: أن يقول لها: أنتِ طالق طالق طالق بدون عطف وتعليق وحكم هذه الصورة أنه يقع بها واحدة إذا نوي بالثانية والثالثة التأكيد.[2]

"اگر اس نے کہا: تجھے طلاق طلاق طلاق بغیر عطف اور تعلیق کے تو اس صورت میں ایک ہی طلاق ہو گی جب اس کی نیت دوسری، تیسری طلاق سے تاکید کی ہو۔"

---

۱ ماہنامہ 'الشریعہ' گوجرانوالہ، دسمبر ۲۰۱۰ء: ص ۴۸، ۴۹

۲ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ: کتاب الطلاق، مبحث تعدد الطلاق: ۴/ ۳۱۰

## فقہ حنبلی کا فتویٰ

حنبلی مسلک کی کتاب 'المغنی' میں علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

فإن قال: أنت طالق طالق، طالق وقال أردت التوكيد قبل منه لأن الكلام يكرّر للتوكيد كقوله عليه السلام: فنكاحها باطل باطل باطل. وإن قُصد الايقاع وكرّر الطلقات طُلّقَت ثلاثا. وإن لم ينو شيئًا لم يقع إلا واحدة.[1]

"اگر کہا: تجھے طلاق ہے طلاق ہے طلاق ہے اور کہے کہ میں نے تاکید کی غرض سے کہا تھا تو اس کا یہ بیان قبول کر لیا جائے گا کیونکہ بات تاکید اُدہرائی جاتی ہے جس طرح کہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: "اس کا نکاح باطل ہے باطل ہے باطل ہے" (یعنی ایک حدیث میں نکاح کے باطل ہونے کا لفظ تاکید کی غرض سے تین مرتبہ دہرایا گیا ہے) لیکن اگر اس کی نیت تین طلاقوں کے ایقاع (واقع کرنے) کی تھی اور طلاقوں کو دہرایا تھا تو پھر تین طلاقیں واقع ہوں گی اور اگر کوئی نیت نہیں تھی تو صرف ایک طلاق ہو گی۔"

## فقہ شافعی کا فتویٰ

شافعی مسلک کی کتاب روضة الطالبين میں امام نوویؒ لکھتے ہیں:

ولو كرّر اللفظة ثلاثًا وأراد بالآخرتين تأكيد الأولىٰ لم يقع إلا واحدة[2]

"اگر اس نے طلاق کا لفظ تین مرتبہ دہرایا لیکن آخری دو مرتبہ سے اس کا مقصد پہلی طلاق کی تاکید تھا تو ایک ہی طلاق واقع ہو گی۔"

## فقہ ظاہری کا فتویٰ

علامہ ابن حزم المحلّٰی میں لکھتے ہیں:

فلو قال لموطوئة: أنت طالق أنت طالق أنت طالق، فإن نوى التكرير لكلمته الأولى وإعلامها فهي واحدة وكذلك إن لم ينو بتكراره شيئًا.[3]

---

۱ المغنی از ابن قدامہ: ۷/۳۶۹، ۲۳۲ دار الفکر، بیروت ۱۹۸۴ء

۲ روضۃ الطالبین ۸/۷۸، طبع المکتب الاسلامی، بیروت ۱۹۹۱ء

۳ المحلی: ۱۰/۱۷۴

"مدخول بہا عورت سے شوہر نے کہا: تجھے طلاق، تجھے طلاق، تجھے طلاق۔ پس اگر اس تکرار سے اس کی نیت پہلی طلاق ہی کی تاکید اور اس کی اطلاع ہے تو یہ ایک ہی طلاق ہے اور اسی طرح اس وقت بھی ایک ہی طلاق ہوگی جب اس تکرار سے اس کی کوئی نیت ہی نہ ہو۔"

## فقہ حنفی کا فتویٰ

① حنفی مسلک کی کتاب 'بہشتی زیور' میں مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم لکھتے ہیں:

"کسی نے تین دفعہ کہا: تجھ کو طلاق، طلاق، طلاق، تینوں طلاقیں پڑ گئیں یا گول الفاظ میں تین مرتبہ کہا، تب بھی تین پڑ گئیں۔ لیکن اگر نیت ایک ہی طلاق کی ہے، فقط مضبوطی کے لئے تین دفعہ کہا کہ بات خوب پکی ہو جائے تو ایک ہی طلاق ہوئی لیکن عورت کو اس کے دل کا حال تو معلوم نہیں، اس لئے یہی سمجھے کہ تین طلاقیں مل گئیں۔"[1]

② مولانا مجیب اللہ ندوی (بھارت): آپ بھی مسئلۂ طلاقِ ثلاثہ میں حنفی موقف کے نہایت سختی سے قائل ہیں لیکن اس کے باوجود اپنی کتاب 'اسلامی فقہ' میں لکھتے ہیں:

"البتہ اگر کسی نے اس طرح کہا کہ تجھ کو طلاق، طلاق، طلاق تو اگر اس سے اس کی نیت تین طلاق دینے کی نہیں تھی بلکہ صرف تاکید کرنی مقصود تھی تو ایک ہی طلاق رجعی پڑے گی۔"[2]

③ مفتی مہدی حسن (سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند): اپنی کتاب إقامة القيامة میں تحریر کرتے ہیں:

"اگر عورت مدخول بہا ہے اور ایک ہی طلاق دینے کا ارادہ تھا لیکن بتکرار لفظ تین طلاق دی اور دوسری اور تیسری طلاق کو بطورِ تاکید استعمال کیا ہو تو دیانتاً قسم کے ساتھ اس کا قول معتبر ہوگا اور ایک طلاقِ رجعی واقع ہوگی، اس میں اختلاف نہیں۔"[3]

④ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (سیکرٹری جنرل مسلم پرسنل لا بورڈ، ہند): تاکید کے طور پر تین مرتبہ طلاق کا لفظ دہرانے کے بارے میں آپ نے 'تین طلاقوں میں تاکید کا اعتبار' کا عنوان قائم کرکے اس پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور آپ بھی ان علماے احناف میں سے ہیں جو ایک مجلس کی تین طلاقوں کے

---

۱ بہشتی زیور: ۴/۱۹

۲ اسلامی فقہ: ۴/۲۶۰

۳ اقامۃ القیامہ: ص ۷۵

تین ہی واقع ہونے کے مسئلے میں سخت متشدد ہیں، لیکن اس کے باوجود لکھتے ہیں:

"ایک مجلس کی تین طلاقیں بھی واقع ہو جائیں گی، لیکن یہ حکم اس صورت میں ہے جب تین کے عدد کی صراحت ہو مثلاً کہا جائے: "میں نے تین طلاقیں دیں۔" اگر صرف طلاق کو تین بار کہا کہ تم کو طلاق، طلاق، طلاق تو اب دو باتوں کا احتمال ہے: ایک یہ کہ تین طلاقیں دینا مقصود ہیں یا یہ کہ ایک ہی طلاق دینی مقصود ہے اور تاکید کے لئے تین بار طلاق کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ پہلی صورت میں تین طلاقیں واقع ہوں گی اور دوسری صورت میں صرف ایک، اس لئے کہ تاکید کسی چیز کے وقوع کو اور (مزید) مؤکد تو کرتا ہے لیکن اس کی تعداد میں کوئی اضافہ نہیں کرتا۔

اس طرح اس معاملے کا دارومدار طلاق دینے والے کے ارادے پر ہے مگر اس میں اس بات کا قوی احتمال تھا کہ لوگ تین طلاق کے ارادے سے اس طرح کا فقرہ استعمال کریں اور بعد میں بیوی کی علیحدگی سے بچنے کے لئے کہہ دیں کہ تاکید کی نیت تھی، اس لئے فقہانے کہا کہ ایسے فقروں میں دیانتاً اور فی مابینہ وبین اللہ تو ایک ہی طلاق واقع ہو گی۔ یہاں تک کہ اگر کوئی اس طرح طلاق دینے کے بعد پھر اپنی بیوی سے رجعت کر لے تو اس کو ان شاء اللہ کوئی گناہ نہ ہو گا۔

مگر ہمارے زمانے میں جہالت اور ناواقفیت اور شرعی تعلیمات سے دوری کے باعث صورتِ حال یہ ہو گئی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ طلاق واقع ہی اس وقت ہوتی ہے جب تین بار طلاق کا لفظ کہا جائے۔ ان حالات میں مناسب ہو گا کہ جہاں صرف لفظ 'طلاق' کا تکرار ہو اور تاکید کا معنی مراد لیا جا سکتا ہو، وہاں ایک ہی طلاق واقع قرار دی جائے اور قضاءً (عدالت میں) بھی اس شخص کی نیت کا اعتبار کیا جائے۔

خوشی کی بات ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے دارالافتانے اس مسئلے میں پیش قدمی کی ہے اور فتاویٰ میں اس کی رعایت شروع کر دی ہے، چنانچہ اس مسئلے پر دارالعلوم دیوبند کا ایک فتوی ملاحظہ ہو:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ زید نے اپنی بیوی کو اس طرح طلاق دی: "تم کو طلاق طلاق طلاق۔" اس صورت میں کون سی طلاق واقع ہو گی اور کیا مراجعت کی گنجائش ہو گی؟

(المستفتی: خالد سیف اللہ رحمانی)

جواب: صورتِ مذکورہ میں ہمارے اطراف کے عرف کے اعتبار سے زید کی مدخولہ بیوی پر ایک طلاقِ رجعی واقع ہوئی۔ اگر آپ کے یہاں کا عرف بھی یہی ہو تو ایک طلاقِ رجعی کے وقوع کا حکم ہو گا۔ طلاقِ رجعی کا حکم ہے کہ اندرونِ عدت رجوع اور بعد عدت بغیر حلالہ کے دوبارہ نکاح جائز ہے۔

واللہ اعلم (الفتاوٰی الھندیۃ:۲/۵۰)

کفیل الرحمٰن نشاط (نائب مفتی دارالعلوم دیوبند) ۲۱/ شعبان ۱۴۰۵ھ

الجواب الصحیح ظفیر الدین غفرلہ (مفتی دارالعلوم دیوبند) ۲۱/ شعبان ۱۴۰۵ھ

مہر دارالافتا، دارالعلوم دیوبند

ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے دوسرے دارالافتا اور اہل علم بھی اسی کے مطابق فتویٰ دیا کریں، اس لئے کہ قریب قریب پورے ملک کا عرف یہی ہے کہ لوگوں نے ناواقفیت کی وجہ سے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جب تک تین بار طلاق کا لفظ نہ استعمال کیا جائے، طلاق واقع ہی نہ ہوگی۔"[1]

از مرتب: اسی سے ملتی جلتی صورت ہمارے خیال میں یہ ہے کہ لوگ شرعی احکام سے عدم واقفیت کی وجہ سے تین کے عدد کے ساتھ طلاق دیتے ہیں لیکن بعد میں جب اس کا علم ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ میں سمجھ رہا تھا کہ تین مرتبہ طلاق کے الفاظ استعمال کئے بغیر طلاق واقع ہی نہیں ہوتی۔

تبصرہ از راقم: اس صورتِ حال کو بھی ہم دردی سے دیکھنا چاہئے اور ایسے شخص کی بھی تین طلاقوں کو تاکید پر محمول کر کے ایک طلاق کے وقوع کا حکم لگانا چاہئے۔

## مسلم ممالک میں طلاق کا قانون

مسلم ممالک نے تطلیقاتِ ثلاثہ کے سلسلے میں جو قوانین بنائے ہیں، ان کی حیثیت شرعی حجت کی نہیں ہے، اس لئے ان قوانین کو دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا، تاہم یہ معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ کن ممالک نے اس سلسلے میں اقدامات کئے ہیں۔ اسی مقصد کے پیش نظر، یعنی بغرضِ معلومات اس کی تفصیل پیش کی جاتی ہے:

① سب سے پہلے مصر نے ۱۹۲۹ء میں ایک ہی وقت کی تین طلاقوں کے اُصول کو ختم کر دیا اور قانون یہ بنایا کہ متعدد طلاقیں صرف ایک شمار ہوں گی اور وہ رجعی ہوگی۔ پیر کرم شاہ ازہری نے بھی اپنی مذکورہ کتاب میں اس مصری قانون کی مختصر تفصیل پیش کی ہے اور اس کے حوالے سے پاکستان کے حنفی علما کو بھی یہی مسلک اپنانے کی تلقین کی ہے۔ اس قسم کا قانون سوڈان نے ۱۹۳۵ء میں، اُردن نے ۱۹۵۱ء میں، شام نے ۱۹۵۳ء میں، مراکش نے ۱۹۵۸ء میں، عراق نے ۱۹۰۹ میں اور پاکستان نے ۱۹۶۱ء میں نافذ کیا۔[2]

---

۱ جدید فقہی مسائل: ۲/۱۰۸ تا ۱۱۱

۲ 'ایک مجلس کی تین طلاقیں...' از راقم: ص ۶۸، ۶۹

## علمائے حنفیہ کے لئے دعوتِ غور و فکر

اور اب سب سے آخر میں مولانا اشرف علی تھانوی کا طرزِ عمل ملاحظہ فرمائیں۔ ضرورت کے تحت فقہ حنفی کو چھوڑنے کے لئے مولانا اشرف علی تھانوی کا طرزِ عمل ایک مثال ہے:

آج سے تقریباً ۸۸ سال قبل ۱۳۵۱ھ / ۱۹۳۲ء میں مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم نے ایک کتاب تالیف فرمائی تھی جس کا نام ہے: الحیلة الناجزة في حلیلة العاجزة (مشکلات سے دوچار شادی شدہ عورت کے لئے کامیاب حیلہ یا تدبیر) اس میں حسبِ ذیل عورتوں کی مشکلات کا حل پیش کیا گیا تھا:

☆ نامرد شخص کی بیوی ☆ مجنون شخص کی بیوی

☆ مُتعنّت (نان نفقہ نہ دینے والے) کی بیوی ☆ مفقود الخبر (لاپتہ شوہر) کی بیوی

ان کا حل پیش کرنے کی وجہ یہ تھی کہ فقہ حنفی میں مذکورہ عورتوں کی مشکلات کا یعنی خاوندوں سے گلو خلاصی (چھٹکارا) حاصل کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے، اس بات کا اعتراف اس کتاب کے نئے ایڈیشن کے دیباچے میں مولانا تقی عثمانی صاحب نے بھی کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> "ایسی خواتین جنہوں نے نکاح کے وقت تفویض طلاق کے طریقے کو اختیار نہ کیا ہو، اگر بعد میں کسی شدید مجبوری کے تحت شوہر سے گلو خلاصی حاصل کرنا چاہیں، مثلاً شوہر اتنا ظالم ہو کہ نہ نفقہ دیتا ہو، نہ آباد کرتا ہو، یا وہ پاگل ہو جائے یا مفقود الخبر ہو جائے یا نامرد ہو اور از خود طلاق یا خلع پر آمادہ نہ ہو تو اصل حنفی مسلک میں ایسی عورت کے لئے شدید مشکلات ہیں، خاص طور پر ان مقامات پر جہاں شریعت کے مطابق فیصلے کرنے والا کوئی قاضی موجود نہ ہو، ایسی عورتوں کے لئے اصل حنفی مسلک میں شوہر سے رہائی کی کوئی صورت نہیں ہے۔"[1]

مولانا اشرف علی تھانوی نے مذکورہ بیشتر مسائل میں فقہ حنفی کو ترک کر کے مالکی مذہب کے مطابق فتویٰ دیا اور اس کی روشنی میں ان کو اپنے شوہروں سے گلو خلاصی (چھٹکارے) کا طریقہ بتلایا، اس کی تفصیل مذکورہ کتاب میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے، علاوہ ازیں مولانا تھانوی کے ان فتووں کو اس وقت کے تمام کبار حنفی علما نے بھی تسلیم کیا جن کی تصدیقات بھی اس کتاب میں موجود ہیں۔ کسی نے بھی ان پر فقہ حنفی سے خروج کا فتویٰ نہیں لگایا کیونکہ کتاب میں مولانا تھانوی نے صراحت کی ہے کہ ضرورتِ شدیدہ کے وقت کسی دوسری فقہ پر عمل کرنے

---

۱ الحیلة الناجزة: ص ۱۰، دار الاشاعت کراچی

کی اجازت خود فقہاے احناف نے دی ہے۔ اسی اجازت کی وجہ سے یہ سہولتیں عورتوں کو دی جارہی ہیں جو فقہ حنفی میں نہیں ہیں۔

یہاں یہ مثال پیش کرنے سے مقصود یہ ہے کہ بیک وقت دی گئیں تین طلاقوں کو نافذ کرکے دفعتاً میاں بیوی کے درمیان علیحدگی کا فیصلہ کردینا بھی ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے بے شمار پیچیدگیاں اور معاشرتی مسائل پیدا ہورہے ہیں جس کی کچھ تفصیل راقم کی محولہ بالا کتاب میں موجود ہے۔ اس کے حل کے لئے بھی ضروری ہے کہ موجودہ علماے احناف مولانا تھانوی کی طرح ایسا اقدام کریں کہ مسئلہ طلاقِ ثلاثہ کی وجہ سے مسلمان عورت جن آلام ومصائب کا شکار ہوتی ہے، اس سے محفوظ ہو جائے اور وہ حل یہی ہے کہ زیر بحث طلاقِ ثلاثہ کو ایک طلاق رجعی شمار کریں جس کی پوری گنجائش شریعت میں بھی موجود ہے اور فقہ حنفی سمیت دیگر مذاہبِ ثلاثہ میں بھی ہے۔

## آمدم بر سر مطلب!

اس ساری تفصیل کے پیش کرنے سے اصل مقصود یہ ہے کہ مسئلہ طلاقِ ثلاثہ میں یہ پوری گنجائش موجود ہے کہ اسے ایک طلاقِ رجعی شمار کرکے خاوند کو عدت کے اندر صلح اور رجوع کرنے کا حق دیا جائے تاکہ گھر اُجڑنے سے بچ جائے لیکن علماے احناف اپنے فقہی جمود کی وجہ سے یہ معقول راستہ اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جس کی وجہ سے پاکستان اور بھارت دونوں ملکوں میں بے شمار خاندان اس جمود کا شکار ہو کر اُجڑ چکے ہیں اور آئے دن یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، حتی کہ نوبت بہ ایں جارسید کہ بھارتی سپریم کورٹ نے اس طریقۂ طلاق کو سب سے بدترین قسم قرار دیا اور پھر بالآخر اس کو غیر قانونی بھی قرار دے دیا۔ (یہ دونوں خبریں آخر میں ملاحظہ کریں)

بھارتی مسلمانوں کے 'مسلم پرسنل لا بورڈ' نے اس فیصلے کو رد کردیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہ مسلمانوں کے مذہب میں مداخلت ہے، ان کے مطابق بھارتی آئین بھی ہر مذہب کے ماننے والوں کو اپنے اپنے مذہب کے مطابق فیصلے کرنے کا حق دیتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بورڈ کے سیکرٹری جنرل مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے کہا ہے کہ مسلمانوں میں طلاق کی شرح بالکل نہ ہونے کے برابر ہے، اس لئے اس مسئلے کی آڑ میں ہندو لابی یکساں سول کوڈ لانا چاہتی ہے، ورنہ سرے سے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔

ہم موصوف کی اس رائے سے تو متفق ہیں کہ یکساں سول کوڈ کے خلاف بھرپور مزاحمت کی جائے، یہ بھارتی مسلمانوں کا مذہبی حق بھی ہے اور آئینی طور پر بھی درست ہے۔ لیکن اس رائے سے اتفاق مشکل ہے کہ سرے

سے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے اور طلاق کی شرح نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہم پاکستان میں بھی سالہا سال سے دیکھ رہے ہیں کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کی وجہ سے گھر اُجڑ رہے ہیں، بچے اور عورتیں بے سہارا ہو رہی ہیں۔ اور ہم سمجھتے ہیں اور اس کے ٹھوس شواہد موجود ہیں کہ بھارت میں بھی اس مسئلے کی وجہ سے مسلمان عورتیں اور بچے مظلومیت کا شکار ہیں۔ اس لئے مسلم پرسنل لا بورڈ، ہند کا یہ دعویٰ کہ یہ مسئلہ ہی نہیں ہے، شتر مرغ کی طرح سر ریت میں چھپانے سے مختلف نہیں ہے۔

یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ نے ایک دستخطی مہم شروع کی ہے جس میں مسلمان عورتوں سے یہ عہد لیا جا رہا ہے کہ ہم شریعتِ اسلامیہ ہی کی روشنی میں اپنا ہر فیصلہ کرنا پسند کرتی ہیں۔ اس مہم کے مطابق پانچ کروڑ مسلمان عورتوں کے دستخط حاصل کر کے حکومتِ ہند کو پیش کئے جا چکے ہیں۔

یہ بھی اپنی جگہ بالکل درست اور مسلمانوں سے شریعت پر استقامت کا عہد بھی اچھا ہے اور حکومت پر یہ واضح کرنا نہایت ضروری ہے کہ مسلمان اپنے مذہب میں حکومت کو مداخلت کی ہرگز اجازت نہیں دیں گے۔ لیکن ہم عرض کریں گے کہ اس جدوجہد کے ساتھ ساتھ اصل مسئلے سے اغماض نہ برتا جائے اور اس سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں اور خرابیوں کو نظر انداز نہ کیا جائے بلکہ منظم انداز میں اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ مسلمانوں میں غلط طریقۂ طلاق سے آئے دن ظلم وستم کی جو صورتیں رونما ہوتی رہتی ہیں جس کا نشانہ زیادہ تر عورتیں ہی بنتی ہیں، اس کا مستقل مداوا ہو سکے اور وہ طریقہ وہی ہے جو خود متعدد علماے احناف نے بھی تجویز کیا ہے جس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں گزری۔

## پس چہ باید کرد

اس مرحلے میں یہ ضروری ہے کہ جس طرح مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم نے زوجۂ مفقود الخبر کے بارے میں حنفی مسلک چھوڑ کر مالکی مسلک کو اختیار کیا اور اس پر دیگر علماے احناف کو بھی قائل کیا، بالکل اسی طرح بھارت کے علمائے احناف کو متفق ہو کر ایک مجلس کی تین طلاقوں میں جو گنجائش خود حنفی علما نے اپنی فقہ حنفی ہی کی روشنی میں بیان کی ہے، اسے اختیار کرنا چاہئے۔

پاک وہند کی مسلمان عورتوں پر یہ اسی قسم کا ایک بڑا احسان ہو گا جو آج سے ۸۸ سال قبل ہندوستان ہی میں ہندوستانی علمائے احناف نے متحد ہو کر اور ایک موقف اپنا کر مسلمان عورتوں پر کیا تھا۔ وما علینا الا البلاغ المبین

حافظ صلاح الدین یوسف (مشیر وفاقی شرعی عدالت، پاکستان)

## مسلمانوں میں تین طلاقیں نکاح ختم کرنے کی بدترین قسم ہے۔ بھارتی سپریم کورٹ

نئی دہلی (آواز نیوز) بھارتی سپریم کورٹ نے بیک وقت تین طلاقوں کو مسلمانوں میں نکاح ختم کرنے کی سب سے بدترین اور نامناسب قسم قرار دے دیا ہے۔ بھارتی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس جے ایس کھیہر کی سربراہی میں پانچ رکنی بنچ نے بیک وقت تین طلاقوں کے حوالے سے کیس کی سماعت کی۔ سابق بھارتی وزیر سلمان خورشید نے عدالت کو بتایا کہ بیک وقت تین طلاقوں کے لئے عدالتی جانچ پڑتال کی ضرورت نہیں ہوتی اور یہ کہ خواتین کے پاس اس بات کا اختیار ہوتا ہے کہ وہ شادی کے وقت نکاح نامے میں یہ شرط عائد کر دیں کہ بیک وقت تین طلاقیں اُنہیں نامنظور ہیں۔ عدالت نے سابق وفاقی وزیر سے کہا کہ ایسے اسلامی اور غیر اسلامی ممالک کی فہرست پیش کریں جہاں بیک وقت تین طلاقیں دینے پر پابندی عائد ہے جس پر بنچ کو بتایا گیا کہ پاکستان، افغانستان، مراکش اور سعودی عرب میں قانونی طور پر نکاح کے خاتمے کے لئے بیک وقت تین طلاقیں دینے کی اجازت نہیں ہے۔ سینئر وکیل رام جیٹھ ملانی نے عدالت میں موقف اختیار کیا کہ بیک وقت تین طلاقیں دینا آئینی بنیادوں پر بھی مساویانہ حقوق پر حملہ ہے۔ اُنہوں نے مزید کہا کہ بیک وقت تین طلاقیں دینے کا حق صرف شوہر کو حاصل ہے جو آئین کے آرٹیکل ۱۴ کی خلاف ورزی ہے۔ رام جیٹھ ملانی کا کہنا ہے کہ اس طرح طلاق دینے کا طریقۂ کار بے رحمانہ اور قرآنِ کریم کے اصولوں کے بھی خلاف ہے جس کی کسی بھی صورت میں وکالت نہیں کی جاسکتی۔ تین طلاقوں سے متاثرہ خاتون کے وکیل نے عدالت کو بتایا کہ دنیا کا کوئی بھی قانون شوہر کی خواہش پر بیوی کو سابقہ بیوی بنانے کے اجازت نہیں دیتا اور یہ لاقانونیت کی سب سے بری قسم ہے۔ عدالت نے فریقین کے دلائل سننے کے بعد ریمارکس دیئے کہ باوجود اس کے کہ مسلمانوں کے کچھ مسالک میں بیک وقت تین طلاقیں دینا جائز ہے لیکن پھر بھی بیک وقت تین طلاقیں دے کر نکاح ختم کرنے کا عمل مسلمانوں میں نکاح ختم کرنے کی سب سے بدترین قسم ہے۔"

(روزنامہ 'آواز' لاہور: ۱۳/ مئی ۲۰۱۷ء)

## بھارتی سپریم کورٹ نے اکٹھے ۳طلاقوں کو غیر قانونی قرار دے دیا!

### معاملہ قانون سازی کے لئے اسمبلی بھیجنے کی تجویز

نئی دہلی (آواز نیوز) بھارتی سپریم کورٹ نے مسلمانوں میں تین طلاق کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ سپریم کورٹ کے ۵رکنی بنچ نے تین طلاق کے خلاف دائر درخواست کی سماعت کی جب کہ عدالت نے تین طلاقوں کو مسلم خواتین کے حقوق کے خلاف قرار دیتے ہوئے اسے غیر قانونی قرار دے دیا۔ پانچ رکنی ججز میں سے تین ججز نے تین طلاقوں کو آئین سے متصادم جب کہ بھارت کے چیف جسٹس سمیت دو ججز نے اس معاملے کو قانون سازی کے لئے اسمبلی میں بھیجنے کی رائے دی۔ چیف جسٹس جے ایس کیہر اور جسٹس ایس عبدالنظیر نے قرار دیا کہ تینوں طلاق کا معاملہ مسلم مذہب کا بنیادی حق ہے اور یہ غیر قانونی نہیں۔ جسٹس کورین جوزف، جسٹس آر ایف ناریمان اور جسٹس یو یو لالت نے تین طلاقوں کو مسلم خواتین کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی اور غیر قانونی قرار دیا۔ بھارتی چیف جسٹس نے ذاتی رائے دیتے ہوئے اور درخواست کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ اس معاملے کو حکومت کے پاس بھیج دیا جائے اور حکم دیا کہ چھ ماہ میں تین طلاقوں پر قانون سازی کی جائے۔ تاہم حتمی فیصلے میں ججز کی تین دو سے رائے آنے کے بعد اکثریت کو سامنے رکھتے ہوئے پانچ رکنی بنچ نے تین طلاقوں کو غیر قانونی قرار دیا۔ عدالتی فیصلے کے بعد تین طلاقوں کے خلاف درخواست گزار شیرابانو کا کہنا تھا کہ آج میں خود کو آزاد محسوس کر رہی ہوں۔ عدالتی فیصلے سے بہت سی مسلم خواتین کو آزادی ملے گی۔ شیرابانو نے دعویٰ کیا کہ بہت سے مسلم ممالک میں تین طلاقوں پر پابندی ہے۔ دوسری جانب بھارت میں سرگرم مسلم تنظیموں کا کہنا ہے کہ ریاست کو مذہب میں مداخلت کا کوئی اختیار نہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ ہندو اکثریت معاشرے میں بڑھتے مسلم اثر ورسوخ سے خوفزدہ ہے۔

(روزنامہ 'آواز' لاہور: ۲۳راگست ۲۰۱۷ء)

# لاپتہ خاوند کا انتظار کب تک کیا جائے؟

ڈاکٹر حافظ عبدالرحمن مدنی (مفتی مجلس التحقیق الاسلامی)

**الاستفتاء:** کیا فرماتے ہیں علماے کرام بیچ اس مسئلہ کے کہ میں نے ساڑھے تین سال قبل اپنی بیٹی..... کی شادی..... سے کی۔ شادی کے دو ماہ بعد ہی میرے داماد کو دہشت گردی کے بعض الزامات کے سبب سیکورٹی ایجنسیاں اٹھا کر لے گئیں۔ اور آج تک تقریباً ساڑھے تین سال گزر چکے ہیں، ہمیں یہ علم نہیں ہو سکا کہ کونسی ایجنسی کی یہ کاروائی ہے۔ اخبارات کے ذریعے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امریکی، بھارتی اور اسرائیلی مشترکہ ایجنسیوں کے علاوہ ہماری ایجنسیاں بھی ایسے کاموں میں مصروف ہیں۔ پھر گمشدہ لوگوں کا سپر قوتوں کے مفادات کے تحت تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ کچھ پتہ نہیں کہ میرا داماد زندہ بھی ہے کہ نہیں؟ اس کے والدین سمیت ہم سب لاعلم ہیں۔ البتہ دو تین سال قبل ہم نے عدالت سے فسخ نکاح کی ڈگری لے لی تھی۔

ہماری جوان بیٹی صرف دو ماہ اپنے شوہر کے ساتھ رہی۔ اس کی حالت بہت قابل رحم ہے۔ ہمیں مختلف اہل علم سے مل کر یہ پتہ چلا ہے کہ مفقود الخبر کی تحقیق کے بعد ائمہ سلف کی آرا مختلف ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ مشہور ہے کہ ان کی رائے چار سال کے بعد فوت شدہ شوہر کی عدت گزار کر نکاحِ ثانی کی اجازت ہے۔ اور فقہ حنفی میں ۷۵ سال سے لیکر ۱۲۰ سال تک انتظار کی بات بھی ملتی ہے۔

اب صورتحال یہ ہے کہ ہمیں ایک مناسب رشتہ مل رہا ہے اور ہم اپنی بیٹی کی شادی وہاں کرنا چاہتے ہیں۔ کیا شریعت کی رو سے ہم ایسا کر سکتے ہیں؟ (ڈاکٹر شیخ محمد انور، سعودی عرب)

## الجواب بعون الوہاب ... بشرطِ صحتِ سوال

① تمام ائمہ سلف لاپتہ شوہر کی بیوی کو نکاح ثانی کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ ان میں اختلاف صرف انتظار کی مدت کی تعیین میں ہے۔ فقہ الواقع کے حوالے سے جس کے سامنے جس پہلو کی اہمیت تھی، اس نے اسے ملحوظ رکھا۔ اس لئے ائمہ کے اختلاف سے گھبرانا نہیں چاہئے، بلکہ وہ فقہ الواقع یا فقہ الاحکام کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی پر مبنی ہوتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم سے اس بارے میں کوئی رائے منقول نہیں ہے۔ لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے عدالتی تسلی کی صورت میں مفقود الخبر کے بارے میں چار سال کی بات مشہور ہے۔ جس کی بنیاد ایک مقدمہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک عدالتی فیصلہ ہے۔ اس فیصلہ کا مرکزی نکتہ شوہر کے لاپتہ ہونے پر صرف اس کی موت کی تسلی پر مبنی ہے۔ اس موت کو

فتویٰ عمومی سمجھ کر جوان عورت کی بے چینی اور مجبوریاں ملحوظ نہیں رکھی جارہی ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا تھا کہ عورت کب تک خاوند کے انتظار میں پر سکون رہ سکتی ہے؟ تو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے چار ماہ مدت بتائی تھی۔ اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی چار سال انتظار کا عمومی فتویٰ نہیں ہے کیونکہ وہ جنگی معرکوں میں مصروف مجاہدین کو چار ماہ کے بعد گھر لانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک مجلس میں طلاق ثلاثہ اور مفقود الخبر کے بارے میں جو بات کہی جاتی ہے، وہ طلاق ثلاثہ کے بارے میں شریعت نہیں ہے بلکہ وہ انتظامی اور تدبیری اقدام تھا۔ اسی لئے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور امام ابن القیم رحمہ اللہ نے اسے شرعی فتویٰ کی بجائے انتظامی اور سیاسی (انسدادی حکم) اقدام قرار دیا ہے۔ اسی طرح امام مالک رحمہ اللہ بھی کسی قضیہ میں عدالتی فیصلوں کو عمومی فتویٰ بنا کر لازمی قرار دینے کے حق میں نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک عدالتی فیصلہ کے صرف فریقین پابند ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عباسی خلفا منصور سے لیکر ہارون الرشید تک نے ان سے کوئی مدون دستور تیار کرنے یا تدوین موطا کی تکمیل کے بعد اسی حدیث وفقہ کے مجموعہ کو بیت اللہ میں لٹکا کر پوری اسلامی مملکت میں اس کے نفاذ کی تجویز پیش کی تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت وحدیث کی پابندی کے علاوہ اپنے سمیت کسی امام کے اجتہادات (فقہ) کی تنفیذ یا پابندی کی تجویز قبول نہ کی۔ امام مالک رحمہ اللہ کا معروف قول ہے:

"كل أحد يؤخذ من قوله، ويُترك إلا صاحب هذا القبر"[1]

"اس صاحبِ قبر (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) کے علاوہ ہر کسی کے قول کو لیا بھی جاسکتا ہے اور چھوڑا بھی جاسکتا ہے۔"

لہٰذا امام مالک رحمہ اللہ سے منسوب چار سالہ انتظار کی رائے ان کا فتویٰ نہیں جس کی وضاحت ان کے اہل حدیث اجتہادی نقطہ نظر رکھنے والے ہم مشرب امام بخاری رحمہ اللہ کی الجامع الصحیح سے ان کی تبویب، ترجمۃ الباب اور ان کی شرائط کے مطابق صحیح حدیث سے ہوتی ہے جو یوں ہے: **بَابُ حُكْمِ الْمَفْقُودِ فِي أَهْلِهِ وَمَالِهِ**

وَقَالَ ابْنُ الْمُسَيِّبِ: «إِذَا فُقِدَ فِي الصَّفِّ عِنْدَ القِتَالِ تَرَبَّصُ امْرَأَتُهُ سَنَةً» وَاشْتَرَى ابْنُ مَسْعُودٍ جَارِيَةً، وَالتَمَسَ صَاحِبَهَا سَنَةً، فَلَمْ يَجِدْهُ، وَفُقِدَ، فَأَخَذَ يُعْطِي الدِّرْهَمَ وَالدِّرْهَمَيْنِ، وَقَالَ: " اللَّهُمَّ عَنْ فُلاَنٍ فَإِنْ أَتَى فُلاَنٌ فَلِي وَعَلَيَّ، وَقَالَ: هَكَذَا فَافْعَلُوا بِاللُّقَطَةِ وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: نَحْوَهُ وَقَالَ الزُّهْرِيُّ: فِي الأَسِيرِ يُعْلَمُ مَكَانُهُ: " لاَ تَتَزَوَّجُ امْرَأَتُهُ، وَلاَ يُقْسَمُ مَالُهُ، فَإِذَا انْقَطَعَ خَبَرُهُ فَسُنَّتُهُ سُنَّةُ الْمَفْقُودِ

---

1 موطا مالک: ۱/۲۵۱

"باب: مفقود الخبر کے اہل وعیال اور مال ومتاع کے متعلق کیا حکم ہے؟
اور ابن المسیب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: جب جنگ کے وقت صف سے کوئی شخص گم ہو جائے تو اس کی بیوی ایک سال تک اس کا انتظار کرے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کسی سے ایک لونڈی خریدی (اس کا مالک قیمت لیے بغیر کہیں چلا گیا اور گم ہو گیا) تو آپ نے اس کے پہلے مالک کو ایک سال تک تلاش کیا، پھر جب وہ نہیں ملا تو غریبوں کو اس لونڈی کی قیمت میں سے ایک ایک دو دو درہم دینے لگے اور دعا کرتے: اے اللہ! یہ فلاں کی طرف سے ہے۔ اگر وہ آ گیا تو لونڈی میری رہے گی اور اس کی قیمت مجھ پر واجب ہو گی۔ اور فرماتے کہ گری پڑی چیز کے بارے میں ایسا ہی کرنا چاہئے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی اسی طرح کا موقف اختیار کیا ہے۔ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے قیدی کے بارے میں جس کی جائے قیام معلوم ہو، کہا کہ اس کی بیوی دوسرا نکاح نہ کرے اور نہ اس کا مال تقسیم کیا جائے، پھر جب اس کی خبر ملنی بند ہو جائے تو اس کا معاملہ بھی مفقود الخبر کی طرح ہو جاتا ہے۔"

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی ایک عادت یہ ہے کہ وہ تبویب میں اجتہادی نکتہ سوال کی صورت میں پیش کرنے کے بعد اس کے متنوع پہلو ترجمۃ الباب میں ائمہ فقہا کے حوالے سے واضح کرتے ہیں۔ پھر بطورِ دلیل حدیث کو پیش کر دیتے ہیں کہ اس میں غور کر کے اطمینان کر لیا جائے۔ باب کے تحت مذکور حدیث یوں ہے:

عَنْ يَزِيدَ مَوْلَى الْمُنْبَعِثِ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سُئِلَ عَنْ ضَالَّةِ الغَنَمِ، فَقَالَ: «خُذْهَا، فَإِنَّمَا هِيَ لَكَ أَوْ لِأَخِيكَ أَوْ لِلذِّئْبِ» وَسُئِلَ عَنْ ضَالَّةِ الإِبِلِ، فَغَضِبَ وَاحْمَرَّتْ وَجْنَتَاهُ، وَقَالَ: «مَا لَكَ وَلَهَا، مَعَهَا الحِذَاءُ وَالسِّقَاءُ، تَشْرَبُ المَاءَ، وَتَأْكُلُ الشَّجَرَ، حَتَّى يَلْقَاهَا رَبُّهَا» وَسُئِلَ عَنِ اللُّقَطَةِ، فَقَالَ: «اعْرِفْ وِكَاءَهَا وَعِفَاصَهَا، وَعَرِّفْهَا سَنَةً، فَإِنْ جَاءَ مَنْ يَعْرِفُهَا، وَإِلَّا فَاخْلِطْهَا بِمَالِكَ» قَالَ سُفْيَانُ: فَلَقِيتُ رَبِيعَةَ بْنَ أَبِي عَبْدِ الرَّحْمَنِ - قَالَ سُفْيَانُ: وَلَمْ أَحْفَظْ عَنْهُ شَيْئًا غَيْرَ هَذَا - فَقُلْتُ: أَرَأَيْتَ حَدِيثَ يَزِيدَ مَوْلَى الْمُنْبَعِثِ فِي أَمْرِ الضَّالَّةِ، هُوَ عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ يَحْيَى: وَيَقُولُ رَبِيعَةُ عَنْ يَزِيدَ مَوْلَى الْمُنْبَعِثِ عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ قَالَ سُفْيَانُ: فَلَقِيتُ رَبِيعَةَ فَقُلْتُ لَهُ[1]

یزید مولی منبعث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سے گم شدہ بکری کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: اسے پکڑ لو، کیونکہ یا تو وہ تمہاری ہو گی یا تمہارے کسی بھائی کی ہو گی یا پھر بھیڑیے کی ہو گی (اگر انہی جنگلوں میں پھرتی رہی) اور آپ ﷺ سے گمشدہ اونٹ کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ غصہ

1 صحیح بخاری: بَابُ حُكْمِ المَفْقُودِ فِي أَهْلِهِ وَمَالِهِ، رقم ۵۲۹۲

میں آ گئے جس کی وجہ سے آپ کے دونوں رخسار سرخ ہو گئے اور آپ نے فرمایا: تمہیں اس سے کیا غرض! اس کے پاس مضبوط پیڈ (کھر) ہیں (جس کی وجہ سے چلنے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہو گی) اور اس کے پاس طبعی مشکیزہ ہے جس سے وہ پانی حاصل کرتا رہے گا اور درخت کے پتے کھا کر اسے پیٹ بھرنے میں بھی کوئی دشواری نہیں، یہاں تک کہ اس کا مالک اسے پالے گا۔ اور نبی کریم ﷺ سے لقطہ (گری پڑی چیز) کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: اس کی رسی (جس سے وہ بندھا ہو) اور اس کے ظرف کا (جس میں وہ رکھا ہو) ایک سال تک اعلان کرو، پھر اگر کوئی ایسا شخص آ جائے جو اسے پہچانتا ہو (اس کا مالک ہو تو اسے دے دو) ورنہ اسے اپنے مال کے ساتھ ملا لو۔ سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ پھر میں ربیعہ بن عبدالرحمن رحمہ اللہ سے ملا... اور مجھے ان سے اس کے سوا اور کوئی چیز محفوظ نہیں ہے... میں نے ان سے پوچھا تھا کہ گم شدہ چیزوں کے بارے میں منبعث کے مولیٰ یزید کی حدیث کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا وہ زید بن خالد سے منقول ہے؟ تو انہوں نے کہا: ہاں! یحییٰ نے بیان کیا کہ ربیعہ نے منبعث کے مولیٰ یزید سے روایت کی ہے، ان سے زید بن خالد نے۔ سفیان نے بیان کیا کہ پھر میں نے ربیعہ سے ملاقات کی اور ان سے اس کے متعلق پوچھ بھی لیا۔"

امام بخاری رحمہ اللہ نے مذکورہ باب کے تحت یہ حدیث بیان کر کے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ مفقود الخبر شوہر کی بیوی ایک سال تک انتظار کرے گی اور اگر ایک سال تک اس کے شوہر کا کوئی پتہ نہ چل سکے تو وہ آگے نکاح کر سکتی ہے۔

② سوال میں جوان بیٹی کی قابل رحم حالت کا ذکر بھی اہمیت رکھتا ہے۔ آج کل کے عام مفتی حضرات اس کا دھیان کم رکھتے ہیں اور فقہی تخریجات (موشگافیوں) میں پڑ کر حیلہ بازی کو رواج دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سے پناہ میں رکھے، آمین۔ عدالت نے نان ونفقہ سمیت دیگر مجبوریوں کے پیش نظر ہی فسخ نکاح کیا ہو گا۔ اگرچہ پاکستانی عدالتیں دستور ۱۹۷۳ء میں بنیادی انسانی حقوق کے نام سے آرٹیکل ۸ سے لیکر ۲۸ تک کے پیش نظر فیصلے دیتی ہیں، جنہیں شریعت کی رو سے حتمی قرار نہیں دیا جا سکتا تاہم مذکورہ معاملے میں شریعت بھی اس فیصلے کی تائید کرتی ہے۔ ہماری نظر میں اس عدالتی فیصلے کی بھی اہمیت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ﴾ (البقرۃ:۲۳۱)

"اور تم انہیں ضرر دینے کے لئے روکے نہ رکھو، اور جو ایسا کرے وہ اپنے آپ پر ظلم کا مرتکب ہو گا۔"

اس اعتبار سے آپ اپنی بیٹی کی شادی آگے کر سکتے ہیں، کیونکہ خاوند کو لاپتہ ہوئے ساڑھے تین سال ہو چکے ہیں۔ ھٰذا ما عندنا واللہ أعلم بالصواب (ڈاکٹر حافظ عبدالرحمن مدنی)

قاری محمد مصطفیٰ راسخ
محقق مجلس التحقیق الاسلامی

# سیدنا عیسیٰ الٰہ تھے، یا نبی؟
## سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی
### اور عیسائیوں کے شبہات کی تفصیلی وضاحت

مولانا خاور رشید بٹ [1]

### جناب مسیح علیہ السلام کا خود کے بارے میں دعوائے نبوت نہ کہ دعوائے اُلوہیت!

① قرآن مجید نے تو واضح الفاظ میں مسیح علیہ السلام کے رسول ہونے کی صراحت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۖ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ ۖ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ ۗ انظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انظُرْ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴿٧٥﴾﴾ [المائدۃ:۷۵]

"مسیح ابن مریم ایک رسول ہی تھے، جن سے پہلے کئی رسول گزر چکے ہیں اور اس کی والدہ راست باز تھی۔ وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھئے ہم ان کے لیے کیسے واضح دلائل پیش کر رہے ہیں پھر یہ بھی دیکھئے کہ یہ لوگ کدھر سے بہکائے جا رہے ہیں؟"

② اور یہ بھی مکالمہ قرآن مجید نے بیان کیا ہے:

﴿وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ أَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ مِن دُونِ اللَّهِ ۖ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ ۚ إِن كُنتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ ۚ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ ۚ إِنَّكَ أَنتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ﴿١١٦﴾ مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ ۖ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿١١٧﴾﴾ [المائدۃ:۱۱۶-۱۱۷]

"جب (قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: "اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کو چھوڑ کر مجھے اور میری والدہ کو الٰہ بنالو۔" حضرت عیسیٰ جواب دیں گے: "اے اللہ! تو پاک ہے، میں ایسی بات کیونکر کہہ سکتا ہوں جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا، اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو تجھے ضرور اس کا علم ہوتا۔ کیونکہ جو کچھ میرے دل میں ہے وہ تو تو جانتا ہے لیکن جو تیرے دل میں ہے وہ میں نہیں جان سکتا۔ تو تو چھپی ہوئی باتوں کو خوب جاننے والا ہے۔ میں نے تو انہیں صرف وہی کچھ کہا تھا

---

[1] ریسرچ سکالر حقوق الناس فاؤنڈیشن، لاہور... استاذ جامعہ لاہور الاسلامیہ (رحمانیہ)، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا کہ اللہ ہی کی عبادت کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی اور جب تک میں ان میں موجود رہا، ان پر نگراں رہا۔ پھر جب تو نے مجھے اٹھالیا تو پھر تو ہی ان پر نگران تھا۔ اور تو تو ساری چیزوں پر شاہد ہے۔"

③ بائبل کا عہد جدید بھی اس پر گواہی دیتا ہے، چنانچہ لکھا ہے:

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اور ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے، جانیں۔"[1]

④ اس اردو کی جب ہم عربی دیکھتے ہیں تو یوں لکھی ہوئی ملتی ہے:

والحياة الأبدية أن يعرفوك أنت الإله الحق وحدك ويعرفوا يسوع المسيح الذى أرسلته[2] اگر حضرت مسیح علیہ السلام خود ہی خدا تھے تو یہ بات کس سے کر رہے تھے؟

⑤ آپ مبعوث (بھیجے گئے) تھے اور یہ اظہر من الشمس ہے کہ بھیجنے والا اور بھیجا گیا دونوں میں فرق ہوتا ہے۔

⑥ تثلیث اور اقانیم کے متعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہرگز کچھ نہ جانتے تھے۔

⑦ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اُلوہیت کا دعویٰ ہرگز نہیں کیا کیونکہ اُنہوں نے الٰہ حقیقی ہونے کی نسبت دوسری ذات کی طرف فرمائی ہے نہ کہ اپنی طرف۔

⑧ پس یسوع نے کہا کہ "جب تم ابن آدم کو اونچے پر چڑھاؤ گے تو جانو گے کہ میں وہی ہوں اور اپنی طرف سے کچھ نہیں کرتا بلکہ جس طرح باپ نے مجھے سکھایا، اسی طرح یہ باتیں کہتا ہوں اور جس نے مجھے بھیجا وہ میرے ساتھ ہے، اس نے مجھے اکیلا نہیں چھوڑا کیونکہ میں ہمیشہ وہی کام کرتا ہوں جو اسے پسند آتے ہیں، جب وہ یہ باتیں کہہ رہا تھا تو بہتیرے اس پر ایمان لائے۔"[3]

کوئی بھی انسان تعصّب کی عینک اتار کر بتا سکتا ہے کہ یہ جملے سن کر ایمان لانے والوں کا ایمان کیسا ہو گا؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بذاتِ خود خدا ہیں اور وہ مدعی الوہیت تھے یا کہ الٰہ کوئی دوسرا ہے اور یہ اس کی طرف سے بھیجے گئے ایک رسول اور نبی تھے؟

⑨ انجیل لوقا کا مصنف حضرت مسیح علیہ السلام کے حوالے سے نقل کرتا ہے کہ "انھوں نے یسعیاہ نبی کا صحیفہ پڑھ کر یہودیوں کو سنایا: خدا کا روح مجھ پر ہے، اس لیے کہ اس نے مجھے غریبوں کو خوشخبری دینے کے لیے

---

۱ انجیل یوحنا ۱۷:۳

۲ Arabic Bible, GNA 083 ۳ انجیل یوحنا ۸:۲۸-۳۰

مسح کیا، اس نے مجھے بھیجا ہے کہ قیدیوں کو رہائی اور اندھوں کو بینائی پانے کی خبر سناؤں، کچلے ہوؤں کو آزاد کروں اور خداوند کے سالِ مقبول کی منادی کروں، پھر وہ کتاب بند کر کے اور خادم کو واپس دے کر بیٹھ گیا اور جتنے عبادت خانے میں تھے، سب کی آنکھیں اس پر لگی تھیں۔ وہ ان سے کہنے لگا کہ آج یہ نوشتہ تمہارے سامنے پورا ہوا ہے اور سب نے اس پر گواہی دی۔"[1]

جناب مسیح علیہ السلام نے یسعیاہ نبی کی یہ پیشین گوئی اپنے حق میں قرار دی ہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک نبی اور رسول تھے، نہ کہ خدا تھے۔

مزید تائید ایسے ہوتی ہے کہ یسعیاہ نبی کی کتاب آج بھی بائبل میں موجود ہے اور اس سے ملتی جلتی عبارت موجود[2] ہے لیکن کسی یہودی نے یہ نہیں سمجھا کہ جس پر یہ صادق آئے گی، وہ خدا ہوگا۔

⑩ کسی بیوہ کا اکلوتا بیٹا مر گیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کو (اللہ تعالیٰ کے حکم سے) زندہ کیا، آگے لکھا ہے:

"سب پر دہشت چھا گئی اور وہ خدا کی تمجید کر کے کہنے لگے کہ ایک بڑا نبی ہم میں برپا ہوا ہے اور خدا نے اپنی اُمّت پر توجہ کی ہے اور اس کی نسبت یہ خبر سارے یہودیہ اور تمام گردونواح میں پھیل گئی۔"[3]

اتنا بڑا معجزہ دیکھنے کے باوجود حاضرین نے انھیں خدا نہیں بلکہ نبی سمجھا اور تمام علاقے میں بھی یہ بات معروف ہوگئی۔ ایسے موقع پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام واضح کر سکتے تھے کہ میں خدا ہوں اور تم مجھے نبی سمجھ رہے ہو۔ ان کی خاموشی کونسی بات بتا رہی ہے؟ ہر زیرک شخص سمجھ سکتا ہے۔

⑪ معاشرے میں ان کی شہرت بطورِ نبی تھی، اس کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ ایک فریسی[4] یہودی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کی، کھانے پر بیٹھے تو ایک بدچلن عورت آ کر ان کے قدموں میں گر پڑی، روئی، اور آنسوؤں سے بھیگے ہوئے جناب مسیح علیہ السلام کے پاؤں کو اپنے بالوں سے پونچھا اور ان پر عطر ڈالا اور بہت چوما۔ آگے لکھا ہے: "اس کی دعوت کرنے والا فریسی یہ دیکھ کر اپنے جی میں کہنے لگا: اگر یہ شخص نبی ہوتا تو جانتا کہ جو اسے چھوتی ہے، وہ کون اور کیسی عورت ہے کیونکہ وہ بدچلن ہے۔"[5]

جناب مسیح علیہ السلام کا دعویٰ اُلوہیت کا ہوتا تو اس فریسی یہودی کو ان کے الٰہ ہونے میں شک گزرنا چاہیے تھا، نہ کہ نبی ہونے پر۔

⑫ عہد جدید میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے مرنے اور پھر جینے کا تذکرہ ہے، دو آدمی آپس میں باتیں کرتے جا رہے

---

۱ انجیل لوقا ۴:۱۸-۲۲
۲ دیکھیں ۶۱:۱-۲
۳ انجیل لوقا ۷:۱۶-۱۷
۴ یہودیوں کا کٹر فرقہ
۵ انجیل لوقا ۷:۳۶-۳۹

تھے، ان میں سے ایک ان کا پیروکار تھا اور اس کا نام کلیپاس تھا، حضرت مسیح علیہ السلام خود زندہ ہونے کے بعد ان کے پاس آ کھڑے ہوتے ہیں اور ان سے ان کی آپس کی باتوں کے متعلق پوچھا تو انھوں نے اس سے کہا: یسوع ناصری کا ماجرا جو خدا اور ساری امت کے نزدیک کام اور کلام میں قدرت والا نبی تھا...۔"[1]

کلیپاس کے پیروکار ہونے کی صراحت بائبل کی مطالعاتی اشاعت والوں نے کی ہے۔[2]

واضح ہوا کہ جناب مسیح علیہ السلام کے ساتھ واقعہ صلیب کے بعد تک بھی ان کے پیروکار انہیں ایک نبی و رسول کی حیثیت سے ہی جانتے اور مانتے تھے۔

⑬ جناب عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک فقیر پیدائشی اندھے کی بینائی لوٹائی تو بعد میں اس کو فریسی یہودیوں کے پاس لے جایا گیا، انھوں نے پھر اس اندھے سے کہا کہ اس نے جو تیری آنکھیں کھولیں تو اس کے حق میں کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا: "وہ نبی ہے۔"[3]

بعد میں اس آدمی اور یہودیوں کے مابین جناب عیسیٰ علیہ السلام کے سچے ہونے پر مناظرہ ہوا تو اس نے اپنی بینائی کو بطورِ دلیل پیش کرتے ہوئے کہا:

"دنیا کے شروع سے کبھی سننے میں نہیں آیا کہ کسی نے جنم کے اندھے کی آنکھیں کھولی ہوں، اگر یہ شخص خدا کی طرف سے نہ ہوتا تو کچھ نہ کر سکتا۔"[4]

واضح ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں اور یہودیوں کے مابین بحث مباحثہ بھی دعویٰ نبوت پر ہوتا تھا، نہ کہ دعویٰ اُلوہیت پر۔

⑭ اور جب وہ یروشلیم میں داخل ہوا تو سارے شہر میں ہل چل پڑ گئی اور لوگ کہنے لگے: یہ کون ہے؟ بھیڑ کے لوگوں نے کہا: "یہ گلیل کے ناصرۃ کا نبی یسوع ہے۔"[5]

اس موقع پر جناب عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کے شاگرد بھی تھے لیکن نہ تو انھوں نے اور نہ ہی کسی شاگرد نے اس پر کوئی تنقید کی۔

⑮ تقریباً پانچ ہزار افراد کو معجزہ کے طور پر تھوڑا سا کھانا پورا ہو گیا تو وہاں موجود سب لوگ کہنے لگے، جبکہ مسیح علیہ السلام اور ان کے شاگرد بھی وہاں موجود تھے:

---

۱ انجیل لوقا ۲۴:۱۳-۲۰

۲ تفسیر بائبل بنام مطالعاتی اشاعت ص ۱۹۱۹، ناشر بائبل سوسائٹی پرانی انارکلی، لاہور

۳ انجیل یوحنا ۹:۱۷

۴ انجیل یوحنا ۹:۳۲-۳۳

۵ انجیل متی ۲۱:۱۰-۱۱

"پس جو نبی دنیا میں آنے والا تھا، فی الحقیقت یہی ہے۔"[1]

⑯ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب دیکھا کہ ان کے علاقے ناصرۃ کے لوگ ان کے معجزات دیکھنے کے باوجود ان پر ایمان نہیں لائے تو فرمانے لگے:

"نبی اپنے وطن اور اپنے گھر کے سوا اور کہیں بے عزت نہیں ہوتا۔"[2]

⑰ جناب عیسیٰ علیہ السلام کو آکر جب بعض فریسیوں نے ڈرایا کہ یہاں سے بھاگ جا کیونکہ ہیرودیس تمہیں قتل کرنا چاہتا ہے تو انھوں نے جواب دیا: اس لومڑی سے کہہ دو کہ دیکھ میں آج اور کل بدروحوں کو نکالتا اور شفا بخشنے کا کام انجام دیتا رہوں گا اور تیسرے دن کمال کو پہنچوں گا مگر آج اور کل اور پرسوں اپنی راہ پر چلنا ضرور ہے کیونکہ ممکن نہیں کہ نبی یروشلیم سے باہر ہلاک ہو۔"[3]

⑱ اپنے شاگردوں کو فرمانے لگے:

"جو تم کو قبول کرتا ہے وہ مجھے قبول کرتا ہے اور جو مجھے قبول کرتا ہے وہ میرے بھیجنے والے کو قبول کرتا ہے۔ جو نبی کے نام سے نبی کو قبول کرتا ہے، وہ نبی کا اجر پائے گا۔"[4]

⑲ جناب عیسیٰ علیہ السلام اپنے معجزات کے سبب معاشرے میں کافی مشہور ہو گئے یہاں تک کہ ہیرودیس بادشاہ تک ان کے چرچے پہنچ گئے۔ ان معجزوں کی وجہ سے لوگوں میں کیا چہ مگوئیاں ہوتی تھیں، ملاحظہ فرمائیں:

"اور ہیرودیس بادشاہ نے اس (مسیح) کا ذکر سنا کیونکہ اس کا نام مشہور ہو گیا تھا اور اس نے کہا کہ یوحنا بپتسما دینے والا مردوں میں سے جی اُٹھا ہے، اس لیے اس سے معجزے ظاہر ہوتے ہیں، مگر بعض کہتے تھے کہ ایلیاہ ہے بعض یہ کہ نبیوں میں سے کسی کی مانند ایک نبی ہے مگر ہیرودیس نے سن کر کہا کہ یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) جس کا سر میں نے کٹوایا، وہی جی اٹھا ہے۔"[5]

یہ ایک فطری بات ہے کہ کسی بھی انسان کا روحانی مرتبہ زیادہ سے زیادہ نبی تک جا سکتا ہے، اس لیے تمام لوگ جناب مسیح علیہ السلام کو نبی کی مانند یا نبی ہی خیال کرتے تھے۔ کسی ایک انسان نے بھی ان کی زندگی میں ان کو خدا نہیں سمجھا۔

⑳ ایک عورت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب اس کی مخفی زندگی کا چہرہ کروایا تو کہنے لگی:

---

۱ انجیل یوحنا ۶:۱۴
۲ انجیل متی ۱۳:۵۷
۳ انجیل لوقا ۱۳:۳۱-۳۴
۴ انجیل متی ۱۰:۴۰-۴۱
۵ انجیل مرقس ۶:۱۴-۱۶

"مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تو نبی ہے۔"[1]

مسیح علیہ السلام نے اس عورت کو غلط نہیں کہا اور نہ ہی اس کی تصحیح کرتے ہوئے، اپنے آپ کو خدا بتایا۔

(۴) عید کے آخری دن عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو تبلیغ کی تو ان کی باتیں سن کر وہاں موجود لوگوں نے ان کی حیثیت متعین کرنے میں اختلاف کیا۔ لکھا ہے: "پس بھیڑ میں سے بعض نے یہ باتیں سن کر کہا: بے شک یہی وہ نبی ہے، اوروں نے کہا: یہ مسیح ہے اور بعض نے کہا: کیوں؟ کیا مسیح گلیل سے آئے گا؟ کیا کتاب مقدس میں یہ نہیں آیا کہ مسیح داود کی نسل اور بیت لحم کے گاؤں سے آئے گا، جہاں داود تھا، پس لوگوں میں اس کے سبب اختلاف ہوا، اور ان میں سے بعض اس کو پکڑنا چاہتے تھے مگر کسی نے اس پر ہاتھ نہ ڈالا۔"[2]

عیسیٰ علیہ السلام اگر خدا ہوتے تو ایسے موقع پر اپنی حیثیت واضح کر کے لوگوں کا اختلاف دور کر سکتے تھے، لیکن ایسا نہیں کیا، معلوم ہوا ان کی حکمت بھری گفتگو سن کر لوگ انہیں نبی اور مسیح ہی خیال کرتے تھے، نہ کہ خدا۔

## مسیحی ردّ عمل

یہ اور اس طرح کے دیگر دلائل جب پیش کیے جاتے ہیں تو مسیحی حضرات ان کا جواب یوں دیتے ہیں:

جناب مسیح کی دو حیثیتیں ہیں: ایک انسانی دوسری الوہی! آپ ایک کامل انسان بھی ہیں اور کامل خدا بھی، لہٰذا یہ جتنے بھی دلائل ہیں، ان سب میں ان کی انسانیت کا روپ ہے یعنی بطورِ انسان یہ کام ان سے صادر ہوئے۔

### جواب

① اصل جواب سے پہلے یہ حوالہ فائدہ سے خالی نہیں ہو گا کہ ۳۲۵ء کی 'نقایہ کونسل' میں ہی کلیسیا نے فیصلہ صادر کر دیا تھا کہ نجات دہندہ (مسیح) کی ذات بابرکات میں خدائی اور انسانی اوصاف کاملیت کے ساتھ موجود ہیں۔[3] معلوم ہوا کہ ابتدا سے ہی مسیحی لوگ جناب عیسیٰ علیہ السلام کی حیثیت میں مختلف اعتقاد رکھتے تھے، اسی لیے تو ان کو سرکاری طور پر اس کا اعلان کرنا پڑا، مزید یہ کہ آج تک عیسائیوں میں ایسے فرقے چلے آتے ہیں جو جناب عیسیٰ علیہ السلام کی صرف ایک حیثیت یعنی انسانی کے قائل ہیں، ان کو خدا تسلیم نہیں کرتے جیسا کہ یونی ٹیرین فرقہ ہے۔ اگر دو حیثیتوں والا نظریہ حقیقی ہوتا تو ابتدا سے لے کر آج تک دو ہزار سال گزرنے کے باوجود اختلافی نہ رہتا۔

② جناب مسیحی علیہ السلام نے کبھی اپنی دو حیثیتوں کا دعویٰ نہیں کیا یہ تو مدعی سست اور گواہ چست والا معاملہ ہے۔

---

۱ انجیل یوحنا ۴:۱۹ ۲ انجیل یوحنا ۷:۴۰-۴۴

۳ مسلم سوالات مسیحی جوابات: ص ۱۵۶ از کرسچین ٹرال، طبع اول ۲۰۱۲ء، ناشر ملٹی میڈیا افیئرز لاہور

بلکہ اس کے برخلاف بائبل واضح اور صاف الفاظ میں خدا تعالیٰ کا یہ قول نقل کرتی ہے:

"میری شفقت موجزن ہے، میں اپنے قہر کی شدت کے مطابق عمل نہیں کروں گا۔ میں ہرگز افرائیم کو ہلاک نہ کروں گا، کیونکہ میں انسان نہیں، خدا ہوں۔"[1]

مزید لکھا ہے: "خدا انسان نہیں کہ جھوٹ بولے اور نہ وہ آدم زاد ہے کہ اپنا ارادہ بدلے۔"[2]

یعنی خدا کی دو حیثیتیں ہو ہی نہیں سکتیں۔

③ مسیحی حضرات نے ان دو حیثیتوں کو تجسیم کی اصطلاح پہنائی ہوئی ہے جس کے حوالے سے عیسائی سکالر کہتے ہیں: "ذاتِ الٰہی کے دوسرے اقنوم (بیٹے) نے جسم اختیار کیا"... آگے جاکر رقم طراز ہیں:

"اگر اس عقیدے کو عہدِ عتیق کے توحید پرستی کے پس منظر میں دیکھا جائے تو کفر نظر آتا ہے اور کٹر یہودی یہی نظریہ رکھتے ہیں۔"[3]

جناب عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کے سامنے جب اللہ تعالیٰ اور خود کو ایک کہا تو یہودی پتھر اٹھا کر انہیں سنگسار کرنے لگے، تو عیسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: میں نے تم کو باپ کی طرف سے بہتیرے اچھے کام دکھائے ہیں، ان میں سے کس کام کے سبب سے مجھے سنگسار کرتے ہو؟ یہودیوں نے اسے جواب دیا کہ اچھے کام کے سبب سے نہیں بلکہ کفر کے سبب سے تجھے سنگسار کرتے ہیں اور اس لیے کہ تو آدمی ہو کر اپنے آپ کو خدا بناتا ہے۔ یسوع نے انہیں جواب دیا کہ تمہاری شریعت میں یہ نہیں لکھا ہے کہ

"میں نے کہا تم خدا ہو؟ جبکہ اس نے انہیں خدا کہا جن کے پاس خدا کا کلام آیا۔"[4]

یہ دو حیثیتیں واضح کرنے کا موقع تھا لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ وضاحت کر دی کہ اگر میں اپنے آپ کو اور خدا کو ایک کہتا ہوں تو یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے پہلے انبیاء کو اللہ تعالیٰ نے خدا کہا۔ اگر سیدنا مسیح کی دو حیثیتیں ہیں تو پھر پہلے انبیا بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں، جبکہ کوئی مسیحی اس کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔

معلوم ہوا کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے جو بعض ایسے مبہم کلمات آئے ہیں، ان سے ہرگز ان کی اُلوہی حیثیت مترشح نہیں ہوتی، یہ مسیحی حضرات کا تحکم اور سینہ زوری ہے۔

④ اگر جناب مسیح علیہ السلام کی دو حیثیتیں تھیں تو سولی پر جس نے جان دی تھی وہ کون تھا جسے مارا گیا، منہ پر تھوکا گیا، کانٹوں کا تاج پہنایا گیا وغیرہ کون تھا؟ اگر انسان (ناسوت) تھا تو پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ ابن اللہ نے ہمارے گناہوں کے کفارے میں جان دی، پھر اس نظریے کو ترک کر دینا چاہیے۔

---

۱ ہوسیع ۹:۱۱ ۲ گنتی ۱۹:۲۳

۳ قاموس الکتاب از ایف ایس خیر اللہ (مسیحی سکالر): ۲۳۴-۲۳۵، ناشر مسیحی اشاعت خانہ فیروز پور روڈ لاہور، طبع نہم، ۲۰۰۸ء

۴ انجیل یوحنا ۱۰:۳۰-۳۵

دریں صورت ماننا پڑے گا کہ جناب مسیح علیہ السلام پر ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب وہ محض انسان تھے، ان کی اُلوہی حیثیت ختم تھی۔ اور اگر کہا جائے کہ یہ ابن اللہ (لاہوت) تھا، خدائی حیثیت تھی تو کیا خدا اتنا کمزور ہو سکتا ہے؟ اور کیا خدا کو موت آسکتی ہے؟ آیا خدا کے منہ پر کوئی تھوک سکتا ہے؟ خدا اتنا عاجز و درماندہ ہو سکتا ہے؟

⑤ ان تمام بائبلی حوالہ جات سے پیچھا چھڑانے کے لیے مسیحیوں کا سیدنا مسیح علیہ السلام کی دو حیثیتوں کو ماننا، ہر مذکورہ بات میں جاری نہیں ہوتا کیونکہ کئی ایسی باتیں ہیں جن کا تعلق (ناسوت) جسم سے ہے ہی نہیں۔

مثلاً انھوں نے اپنے دوبارہ آنے کے وقت سے لاعلمی کا اظہار کیا۔

انجیر کے درخت کو دور سے دیکھ کر پہچان نہ سکے کہ پھل ہے کہ نہیں؟

⑥ "اور یسوع حکمت اور قد و قامت میں اور خدا اور انسان کی مقبولیت میں ترقی کرتا گیا۔"[1]

جسم کبھی علم اور بے علمی سے متصف ہوتا ہے؟ نیز کیا جسم بھی کبھی حکیم و دانا ہوا ہے؟

اسی طرح جناب مسیح علیہ السلام کا خوف زدہ ہونا، غم زدہ ہونا، مضطرب ہونا کیا ان کا تعلق جسم سے ہے؟

⑦ جناب مسیح علیہ السلام کا دو حیثیتیں تسلیم کرنا یعنی لاہوتی (الوہی) اور ناسوتی (بشری) تقاضا کرتا ہے کہ یہ ایک ہی وقت میں خالق بھی ہوں اور مخلوق بھی ہوں، رازق بھی ہوں اور مرزوق بھی ہوں، غنی بھی ہوں اور محتاج بھی ہوں، کامل بھی ہوں اور ناقص بھی ہوں، ہر چیز کو جاننے والا بھی ہوں اور جاہل بھی ہوں، قدیم بھی ہوں اور حادث بھی ہوں۔

کیا یہ محال نہیں؟ اور کیا کوئی عقل مند ایسی ناممکن چیز کو تسلیم کرلے گا...؟

بالفرض اگر کوئی کہہ دے کہ یہ دونوں حیثیتیں اکٹھی طاری نہیں ہوتی تھیں تو اس کا جواب یوں ہے:

جناب مسیح علیہ السلام پر جب ناسوتی (انسانی) کیفیت ہوتی تھی وہ اس وقت خدائی صفات سے خالی ہوتے تھے، یعنی کوئی وقت ایسا بھی ان پر آتا تھا جب وہ خدائی صفات سے عاری ہوتے تھے۔

کیا خدا ایسا ہوتا اور ہو سکتا ہے...؟

یہ اعتراضات ملاحظہ کرنے کے بعد عیسائیوں کی طرف سے یہ جواب آتا ہے کہ ناممکنات اشیا کا اجتماع مخلوق میں محال ہے، خدا میں نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ

⑧ اس طرح تو پھر ہر مذہب والا سچا ہے خواہ اس کا تعلق ہندومت سے ہو یا یونانی بت پرستی سے کیونکہ انھوں نے اپنے دیوتاؤں کے حوالے سے جو دیومالائی داستانیں گھڑی ہوئی ہیں وہ بھی درست قرار پاتی ہیں، نیز مسیحیوں کی طرح تثلیث ہی کیا پھر تو ہزاروں خداؤں کا تصور بھی صحیح ہوا۔

---

1 انجیل لوقا ۲:۵۲

کوئی مسیحی اس کو اپنے ہی اصولوں کے مطابق تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے؟ ہر گز ایسا کوئی نہیں ملے گا جس سے معلوم ہوا کہ ان کی طرف سے آنے والا درج بالا جواب حقیقت کے خلاف ہے۔

⑨ اللہ تعالیٰ کی قدرت گو کہ غیر محدود اور مطلق ہے لیکن اس کا تعلق عقلی لحاظ سے ممکن اشیا سے ہے، نہ کہ غیر ممکن سے مثلاً: انہی مسیحی لوگوں سے ہم پوچھتے ہیں کہ آیا اللہ تعالیٰ اپنے جیسا کوئی دوسرا خدا پیدا کر سکتا ہے؟ اگر وہ کہیں جی ہاں تو ہم پوچھیں گے یہ تو مخلوق ہو گا، وہ اللہ کے برابر اور اس جیسا کیسے ہو گیا؟

اگر وہ مخلوق ہے تو الٰہ نہیں اگر الٰہ ہے تو مخلوق نہیں۔

کیا یہاں بھی درج بالا اصول لاگو ہو سکتا ہے؟

⑩ ایک اور انداز سے: کیا اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے کسی کو اپنی خدائی اور اختیارات سے باہر کر سکتا ہے؟

اگر جواب ہاں میں ہے تو مطلب ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی بادشاہی اختیارات اور طاقت ایک خاص حد اور علاقے تک ہے۔ اور اگر جواب نفی میں ہے اور یہی صحیح ہے تو معلوم ہوا کہ قدرت الٰہی کا تعلق عقلی لحاظ سے محال اور ناممکن چیزوں سے نہیں۔

⑪ ملحدین اکثر یہ سوال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسا پتھر بنا سکتا ہے جس کو وہ خود بھی نہ اٹھا سکے؟

مسیحی کیا جواب دیں گے؟... اگر جواب ہاں میں دیا جائے تو اللہ تعالیٰ کی کمزوری ثابت ہوتی ہے اور اگر نفی میں جواب ہو تو اللہ تعالیٰ کی قدرت میں نقص لازم آتا ہے۔

لامحالہ یہی کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت وطاقت لاانتہا ہے۔ یہ چیز اس میں نقص ثابت کرتی ہے، اس لیے اس کی شان کے لائق ہی نہیں لہٰذا وہ کسی چیز سے عاجز نہیں آ سکتا، اور اس کا عاجز نہ آنا اس کی کمالِ قدرت وطاقت پر دلالت کرتا ہے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نہ تو بھولتا ہے اور نہ ہی کوئی چیز اس سے چھپ سکتی ہے۔

مسیحی لوگوں کے بقول یہ محال اشیا اللہ تعالیٰ میں پائی جانی چاہئیں۔ نعوذ باللہ من ذٰلك

## خلاصہ

اناجیل نے جناب مسیح علیہ السلام میں بشری کمزوری واضح کی ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہر گز نہیں، لہٰذا ان کمزوریوں کے باوصف حضرت مسیح علیہ السلام خدا نہیں ہو سکتے۔

بائبل ہمیں بتاتی ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفات ذاتی ہیں، ان میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ لکھا ہے: ''کیوں کہ میں خداوند لاتبدیل ہوں۔''[1]

---

1 ملاکی ۳:۶

یعقوب کے خط میں ہے: ”اے میرے پیارے بھائیو! فریب نہ کھانا، ہر اچھی بخشش اور ہر کامل انعام اوپر سے ہے اور نوروں کے باپ کی طرف سے ملتا ہے جس میں نہ کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے اور نہ گردش کے سبب سے اس پر سایہ پڑتا ہے۔“[1]

ایک افسردہ دل خدا تعالیٰ کو مخاطب ہو کر کہتا ہے:

”تو ان کو لباس کی مانند بدلے گا اور وہ بدل جائیں گے، پر تو لا تبدیل ہے۔“[2]

## عیسائیوں کے قولی شبہات کا اِزالہ

### شبہ اوّل: بائبل میں 'مسیح کو ابن اللہ' کہا گیا ہے!

”جناب مسیح علیہ السلام کو اناجیل اربعہ اور دیگر خطوط و رسائل میں کئی مرتبہ 'ابن اللہ' کہہ کر پکارا گیا ہے جس سے ان کی اُلوہیت ثابت ہوتی ہے کیونکہ بیٹا اپنے باپ کے جوہر سے ہی ہوتا ہے۔“

جواب: جو لوگ بائبل کا مطالعہ نہیں رکھتے، ان کی نظر میں یہ بہت وزنی دلیل ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے کیونکہ ابن اللہ کا لفظ فقط جناب عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے ہی نہیں آیا بلکہ بائبل اس سے بھری پڑی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بائبلی اصطلاح کے مطابق خدا کا بیٹا اللہ تعالیٰ کے محبوب، مقرب، اور پسندیدہ شخص پر بولا جاتا ہے، نہ کہ اس کا حقیقی معنیٰ مراد لیا جائے گا۔ ورنہ سب وہ لوگ جن کے حق میں بائبل کے اندر یہ لقب استعمال ہوا وہ بھی خدا تعالیٰ کے حقیقی فرزند کہلانے کے حقدار ٹھہرتے ہیں، ان کا تذکرہ آگے آرہا ہے۔

دوم: جناب مسیح علیہ السلام کے لیے آنے والا لفظ 'ابن اللہ' اگر اپنے حقیقی معنی میں ہے تو پھر بائبل میں ہی ان کے لیے آنے والے الفاظ ابن آدم[3] اور ابن داود[4] کے متصادم ہے کیونکہ یہاں بھی حقیقی معنی ہی مراد ہے اور یہ ممکن ہی نہیں کسی کے دو حقیقی والد ہوں، لا محالہ ایک کو مجازی معنی میں ماننا پڑے گا۔ سو مجازی معنیٰ اسی کا لیا جائے گا جس کی بائبل تصدیق کرتی ہے اور وہ 'ابن اللہ' ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام ناسوت کے لحاظ سے ابن انسان اور لاہوت کے اعتبار سے ابن اللہ تھے تو یہ بھی ناقابل قبول اور کمزور بات ہے کیونکہ جیسا کہ پیچھے گزرا کہ ایک ہی شخص ایک ہی وقت میں خالق و مخلوق، رازق و مرزوق، الٰہ اور بندہ نہیں ہو سکتے۔

---

۱ یعقوب کا خط ۱:۱۶-۱۷

۲ زبور ۱۰۲:۲۷

۳ انجیل متی ۸:۲۰ وغیرہ ۴ انجیل متی ۱:۱

سوم: کسی بھی کتاب کے مغلق لفظ کی بہترین اور معتبر تشریح وہی ہوتی ہے جو اسی کتاب میں کر دی گئی ہو، چنانچہ لفظ 'ابن اللہ' کی تشریح عہد جدید میں یوں کی گئی اور وہ بھی جناب عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق:

"انجیل مرقس کا مصنف جناب مسیح علیہ السلام کے آخری لمحات کی تصویر کشی یوں کرتا ہے: اور جو صوبہ دار اسکے سامنے کھڑا تھا اس نے اسے یوں دم دیتے ہوئے دیکھ کر کہا بے شک یہ آدمی خدا کا بیٹا تھا۔"[1]

جبکہ یہی واقعہ انجیل لوقا کے مصنف نے یوں نقل کیا ہے:

"اے باپ! میں اپنی روح تیرے ہاتھوں میں سونپتا ہوں اور یہ کہہ کر جناب مسیح علیہ السلام نے دم دے دیا، یہ ماجرا دیکھ کر صوبہ دار نے خدا کی تمہید کی اور کہا: بے شک یہ آدمی راست باز تھا۔"[2]

معلوم ہوا خدا کا بیٹا نیک صالح اور برگزیدہ شخص پر بولا جاتا ہے نا کہ خدا کے حقیقی بیٹے پر۔

## 'خدا کا بیٹا'

یہ اصطلاح یہودیوں میں پہلے سے رائج تھی لیکن جو مفہوم عیسائی حضرات نے بعد میں گھڑا، اہل یہود کے ہاں وہ سراسر کفر اور قابل گردن زدنی ہے، چنانچہ جب یہ کسی کو خدا کا بیٹا کہیں گے تو لامحالہ وہی مطلب ہوگا جو توحید کے منافی نہ ہو اور بائبل عہد قدیم کے مطابق ہو اور وہ ہے: محبوب، پیارا، نیک، صالح اور راست باز۔

① سو ایک یہودی عالم نتن ایل کو جناب عیسیٰ علیہ السلام کے شاگرد فلپس نے کہا:

"جس کا ذکر موسیٰ نے توریت میں اور نبیوں نے کیا ہے، وہ ہم کو مل گیا۔ وہ یوسف کا بیٹا یسوع ناصری ہے، نتن ایل نے اس سے کہا: کیا ناصرۃ سے کوئی اچھی چیز نکل سکتی ہے؟ فلپس نے کہا: چل کر دیکھ لے۔ یسوع نے نتن ایل کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس کے حق میں کہا: دیکھو یہ فی الحقیقت اسرائیلی ہے، اس میں مکر نہیں۔ نتن ایل نے اس سے کہا: تو مجھے کہاں سے جانتا ہے؟ یسوع نے اس کے جواب میں کہا: اس سے پہلے کہ فلپس نے تجھے بلایا، جب تو انجیر کے درخت کے نیچے تھا تو میں نے تجھے دیکھا۔ نتن ایل نے اس کو جواب دیا: اے ربی! تو خدا کا بیٹا ہے۔"[3]

یہ واقعہ اس دن کا ہے جبکہ ابھی تبلیغ شروع کیے جناب عیسیٰ علیہ السلام کو دوسرا دن تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک یہودی عالم 'خدا کے بیٹے' کی اصطلاح ایسے مفہوم میں بولے جو ابھی ایجاد ہی نہیں ہوا اور نہ ہی معروف ہوا۔ لامحالہ وہ اس کا وہی مطلب لے رہا ہے جو اس کی شریعت میں تھا اور وہ نیک، صالح اور راستباز کا مفہوم ہے۔

---

۱ انجیل مرقس ۱۵:۳۹

۲ انجیل لوقا ۲۳:۴۶-۴۷

۳ انجیل یوحنا ۱:۴۵-۴۹

② یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے بائبل میں برے انسان کو 'شیطان کا بیٹا' کہا گیا ہے۔[1]

③ جناب مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا: "مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا کا بیٹا کہلائیں گے۔"[2]

اسی انجیل کے اسی باب میں آگے جا کر یہ قول لکھا ہوا ہے:

"لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور ستانے والوں کے لیے دعا کرو تاکہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے، بیٹے ٹھہرو۔"[3]

④ انجیل لوقا میں لکھا ہے: "تم اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور بھلا کرو اور بغیر ناامید ہوئے قرض دو تو تمہارا اجر بڑا ہوگا اور تم خدا تعالیٰ کے بیٹے ٹھہروگے۔"[4]

جناب عیسیٰ علیہ السلام نے اہل جنت کے متعلق فرمایا:

"ان میں بیاہ شادی نہ ہوگی کیونکہ وہ پھر مرنے کے بھی نہیں۔ اس لیے کہ فرشتوں کے برابر ہوں گے اور قیامت کے فرزند ہو کر خدا کے بھی فرزند ہوں گے۔"[5]

⑤ انجیل یوحنا میں یوں آیا ہے: "لیکن جتنوں نے اسے (یعنی مسیح کو) قبول کیا، اس نے اُنہیں خدا کے فرزند بننے کا حق بخشا یعنی اُنھیں جو اس کے نام پر ایمان لاتے ہیں۔ وہ نہ خون سے، نہ جسم کی خواہش سے، نہ انسان کے ارادہ سے بلکہ خدا سے پیدا ہوئے۔"[6]

اناجیل کے ان حوالہ جات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے مصنفین کے ہاں 'ابن اللہ' اور 'خدا کا بیٹا' نیک صالح اور اللہ تعالیٰ کے محبوب مقرب شخص پر بولا جاتا ہے۔

## 'خدا کا بیٹا' مجازی مفہوم میں

⑥ عہد جدید کے بعض خطوط میں 'ابن اللہ' کا مجازی معنیٰ اس قدر واضح موجود ہے کہ کسی شک و تردّد کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ یوحنا کے پہلے خط میں لکھا ہے:

"جس کا یہ ایمان ہے کہ یسوع ہی مسیح ہے وہ خدا سے پیدا ہوا ہے اور جو کوئی والد سے محبت رکھتا ہے وہ اس کی اولاد سے بھی محبت رکھتا ہے، جب ہم خدا سے محبت رکھتے اور اس کے حکموں پر عمل کرتے

---

۱ رسولوں کے اعمال ۱۳:۱۰
۲ انجیل متی ۵:۹
۳ انجیل متی ۵:۴۴-۴۵
۴ انجیل متی ۶:۳۵
۵ انجیل لوقا ۲۰:۳۶،۳۵
۶ انجیل یوحنا ۱:۱۳:۱۲

ہیں تو اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ خدا کے فرزندوں سے بھی محبت رکھتے ہیں۔"[1]

اس خط کے اسی باب کے آخر میں ہے:

"ہم جانتے ہیں کہ جو کوئی خدا سے پیدا ہوا ہے، وہ گناہ نہیں کرتا بلکہ اس کی حفاظت وہ کرتا ہے جو خدا سے پیدا ہوا اور وہ شریر اسے چھونے نہیں پاتا۔"[2]

اسی خط کے تیسرے باب میں مزید وضاحت ہے:

"جو کوئی خدا سے پیدا ہوا ہے، وہ گناہ نہیں کرتا کیونکہ اس کا تخم اس میں بنا رہتا ہے بلکہ وہ گناہ کر ہی نہیں سکتا کیونکہ خدا سے پیدا ہوا ہے، اسی سے خدا کے فرزند اور ابلیس کے فرزند ظاہر ہوتے ہیں۔"[3]

باب چہارم میں یوں لکھا ہے:

"اے عزیزو! آؤ ہم ایک دوسرے سے محبت رکھیں کیونکہ محبت خدا کی طرف سے ہے اور جو کوئی محبت رکھتا ہے، وہ خدا سے پیدا ہوا ہے اور خدا کو جانتا ہے۔"[4]

⑦ پولوس نے ایک خط میں لکھا ہے:

"اس لیے کہ جتنے خدا کے روح کی ہدایت سے چلتے ہیں، وہی خدا کے بیٹے ہیں، کیونکہ تم کو غلامی کی روح نہیں ملی جس سے پھر ڈر پیدا ہو بلکہ لے پالک ہونے کی روح ملی جس سے ہم ابا یعنی اے باپ! کہہ کر پکارتے ہیں۔ روح خود ہماری روح کے ساتھ مل کر گواہی دیتا ہے کہ ہم خدا کے فرزند ہیں۔"[5]

⑧ اپنے دوسرے خط میں پولوس یوں گویا ہوا:

"سب کام شکایت اور تکرار کے بغیر کیا کرو تاکہ تم بے عیب اور بھولے ہو کر ٹیڑھے اور کج رو لوگوں میں خدا کے بے نقص فرزند بنے رہو۔"[6]

ان تمام حوالہ جات میں خدا کا بیٹا خدا کے بیٹے اور خدا سے پیدا ہوئے جیسے الفاظ اپنے حقیقی معنی میں نہیں بلکہ مجازی طور پر مستعمل ہیں۔

---

۱ یوحنا کا پہلا خط ۵:۱-۲

۲ یوحنا کا پہلا خط ۵:۱۸

۳ یوحنا کا پہلا خط ۳:۹-۱۰

۴ یوحنا کا پہلا خط ۴:۷

۵ رومیوں کے نام خط ۸:۱۴-۱۶

۶ فلپیوں کے نام خط ۲:۱۴-۱۵

## انبیاے بنی اسرائیل کے لئے 'خدا کا بیٹا'

⑨ عہد قدیم اور عہد جدید میں کئی مقامات پر بنی اسرائیلی انبیاے کرام کے لیے بھی 'خدا کا بیٹا' اور کئی کے لیے 'خدا کا پہلوٹھا بیٹا' کی اصطلاح بولی گئی ہے:

"انجیل لوقا میں جناب مسیح علیہ السلام کا نسب نامہ لکھا ہوا ہے جسے آدم علیہ السلام تک پہنچایا گیا اور ان کا تذکرہ پھر یوں ہے: آدم ابن خدا۔"[1]

یہ بات واضح ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام خدا تعالیٰ کے حقیقی بیٹے نہ تھے۔ کوئی مسیحی بھی ان کو حقیقی بیٹا ماننے کے لیے تیار نہیں، لہٰذا سیدنا مسیح علیہ السلام کے لیے آنے والا یہی لفظ ان کے حقیقی بیٹے ہونے پر کیسے دلالت کر سکتا ہے۔

مزید یہ کہ جناب آدم علیہ السلام بغیر ماں اور بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ تو تھیں، لہٰذا اگر حقیقی بیٹا ماننا ہی ہے تو آدم علیہ السلام اس کے زیادہ حق دار تھے، جبکہ نہ مسلمان ایسا مانتے ہیں اور نہ ہی مسیحی۔

⑩ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جب فرعون کے پاس بات چیت کے لیے بھیجا تو فرمایا:

"تب تو فرعون سے یوں کہنا کہ خداوند نے یوں فرمایا ہے کہ اسرائیل میرا پہلوٹھا بیٹا ہے، اس لیے میں تجھ سے کہتا ہوں کہ میرے بیٹے کو جانے دے تاکہ وہ میری بندگی کرے اور اگر اسے نہیں جانے دیتا تو دیکھ میں تیرے پہلوٹھے بیٹے کو مار ڈالوں گا۔"[2]

⑪ حضرت داود علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اور جب تیرے دن تمام ہو جائیں اور تو اپنے باپ دادا کے ساتھ سو جائے اور جب میں تیرے بعد تیری نسل کو جو تیری صلب سے ہو گی برپا کروں گا اور اسی سلطنت کو مستقل کروں گا تو وہ میرے نام کے لیے ایک گھر بنائے گا اور میں اس کی سلطنت کے تخت کو ابد تک برقرار رکھوں گا۔ میں اس کا باپ ہوں گا اور وہ میرا بیٹا ہو گا۔"[3]

⑫ داود علیہ السلام کے حوالے سے خدا تعالیٰ نے کہا:

"وہ مجھے پکارے گا کہ تو میرا باپ ہے، میرا خدا اور میری نجات کی چٹان ہے اور میں اسے پہلوٹھا بناؤں گا، میں بادشاہوں میں سب سے اعلیٰ۔"[4]

---

۱ انجیل لوقا ۳:۳۸

۲ خروج ۴:۲۲-۲۳

۳ ۲-سموئیل ۷:۱۲-۱۳

۴ زبور ۸۹:۲۷-۲۸

⑬ یرمیاہ نبی کی کتاب میں خدا تعالیٰ کا قول یوں لکھا ہے:

"میں اسرائیل کا باپ ہوں اور افرائیم (اسرائیل کا ہی دوسرا نام) میرا پہلوٹھا ہے۔"[1]

اگر خدا کا بیٹا کہنے سے حقیقی بیٹا مراد ہے تو سیدنا داود علیہ السلام اور سیدنا یعقوب (اسرائیل) علیہ السلام زیادہ حق دار ہیں کیونکہ سابقہ شریعتوں اور معاشرتی رواج کے مطابق پہلوٹھا (بڑا بیٹا) بعد والوں سے باپ کے زیادہ قریب اور احترام کے زیادہ لائق ہوتا ہے بلکہ بعض علاقوں میں تو اس کو باپ کی جگہ پر ہی سمجھا جاتا ہے۔

## بنی اسرائیل 'خدا کے فرزند'

⑭ عہد قدیم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کئی مقامات پر سیدنا یعقوب علیہ السلام کی تمام اولاد کو بھی خدا کے فرزند کہا گیا ہے، چنانچہ لکھا ہے: "تم خداوند اپنے خدا کے فرزند ہو۔"[2]

⑮ اسی کتاب میں بنی اسرائیل سے خدا کی ناراضگی کے حوالے سے لکھا ہے:

"اور خدا نے دیکھا اور متنفر ہوا اور بیٹوں اور بیٹیوں سے غصہ ہوا۔"[3]

⑯ زبور میں آیا ہے: "میں نے کہا تم خدا ہو تم سب حق کے فرزند ہو تو بھی تم آدمیوں کی طرح مرو گے اور سرداروں میں سے ایک کی طرح گر جاؤ گے۔"[4]

⑰ بنی اسرائیل کے حوالے سے خدا نے کہا: "میں نے فرزندوں کی تربیت کی اور انھیں سرفراز کیا مگر انھوں نے میرے خلاف سرکشی کی۔"[5]

⑱ مزید لکھا ہے: "اور بنی اسرائیل کا شمار ساحل کی ریت کی طرح ہو گا جو ناپی نہیں جاتی اور گنی نہیں جاتی اور اس کی بجائے کہ ان سے کہا جائے کہ تم میری امت نہیں۔ وہ زندہ خدا کے فرزند کہلائیں گے۔"[6]

⑲ اس کتاب میں آگے جا کر خدا تعالیٰ کا یہ قول لکھا ہے: "جب بنی اسرائیل ہنوز بچہ ہی تھا تو میں نے اس سے محبت رکھی اور میں نے مصر سے اپنے بیٹے کو بلایا۔"[7]

## فرشتے 'خدا کے فرزند'

بائبل ہمیں بتاتی ہے کہ فرشتوں کو بھی خدا تعالیٰ کے بیٹے اور فرزند کہا گیا ہے، چنانچہ لکھا ہے: "اور ایک دن

---

۱ یرمیاہ ۳۱:۹
۲ استثنا ۱۴:۱
۳ استثنا ۳۲:۱۹
۴ زبور ۸۲:۶-۷
۵ یسعیاہ ۱:۲
۶ ہوسیع ۱:۱۰ ۷ ہوسیع ۱۱:۱

خدا کے بیٹے خداوند کے حضور حاضر ہونے کے لیے آئے اور شیطان بھی ان کے درمیان آیا۔"[1]

یہی بات اسی کتاب کے دوسرے باب، فقرہ ایک میں بھی لکھی ہوئی ہے۔

کوئی بھی مسیحی ان مقامات پر حقیقی معنی لینے کے لیے تیار نہیں ہو گا، لہٰذا جناب مسیح علیہ السلام کے متعلق آنے والے اسی لفظ کو بھی انہی دلائل کی روشنی میں مجازی معنی میں لیا جائے گا۔

'خدا کے فرزند' کی اصطلاح عہد قدیم میں آئی ہے جس کے اوّلین مخاطب یہودی ہیں اور ان کی ہی زبان میں ہے، لہٰذا جب یہ لوگ اس کو مجازی مفہوم میں لیتے ہیں تو بعد میں نئے آنے والے غیر زبانوں کے افراد اس کا مفہوم کیسے بدل سکتے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ لفظ فرزند اور بیٹے کی اصطلاح ہر لغت میں پائی جاتی ہے اور وہاں اس کو مجازی معنی میں ہی لیا جاتا ہے، مثلاً ہمارے ہاں ابن الوقت کا لفظ ہے، عربی میں مسافر کو ابن السبیل کہا جاتا ہے، اس طرح کسی بھی تعلیمی ادارے سے تعلیم مکمل کرنے والوں کو أبناء جامعہ کہا جاتا ہے۔ وغیرہ

بائبل میں بھی اس طرح ہے:

"چنانچہ جناب مسیح علیہ السلام نے جہنم میں جانے والوں کو جہنم کے فرزند کہا۔"[2]

اوریر وشلیم شہر کے رہنے والوں کو 'اس کے بچے' قرار دیا۔[3]

دنیادار لوگوں کو اس 'عالَم کے فرزند' کہا ہے۔[4]

جبکہ نیک اور راست باز لوگوں کو 'قیامت کے فرزند' کہا ہے۔[5]

یہ تو جناب عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال تھے جبکہ پولوس نے تھسل نیکیوں کو 'نور' اور 'دن کے فرزند' کہا ہے۔[6]

کیا اب بھی کوئی گنجائش باقی ہے؟

اعتراض: اس تفصیل کے باوجود مسیحی حضرات جناب مسیح علیہ السلام کو خدا کا حقیقی بیٹا قرار دینے کی ضد کرتے ہیں اور ان دلائل کے مقابل کہتے ہیں کہ دراصل ان کو خدا نے 'اکلوتا فرزند' کہا ہے جبکہ باقی مقامات پر ایسا نہیں۔[7]

جواب: از روئے بائبل لفظ 'اکلوتا' کوئی ایسی حیثیت نہیں رکھتا کہ جس میں حقیقی معنی کے علاوہ کوئی دوسرا

---

۱ ایوب ۱:۶
۲ انجیل متی ۲۳:۵
۳ انجیل متی ۲۳:۳۷
۴ انجیل لوقا ۲۰:۳۴
۵ انجیل لوقا ۲۰:۳۶
۶ تھسل نیکیوں کے نام پہلا خط ۵:۵
۷ انجیل لوقا ۹:۳۸

مفہوم پایا ہی نہیں جا سکتا۔ بلکہ اس میں رفعت، بلندی اور خصوصیت کا معنی بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ تورات میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے چھوٹے بیٹے اسحاق کو ان کا 'اکلوتا فرزند' کہا گیا ہے۔[1] حالانکہ ابراہیم علیہ السلام کا بڑا بیٹا اسماعیل علیہ السلام زندہ اور موجود تھا۔

کیا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ صرف اور صرف جناب اسحاق علیہ السلام ہی ان کے حقیقی بیٹے تھے؟ واضح رہے کہ بائبل میں سیدنا اسماعیل علیہ السلام کو بھی جناب ابراہیم علیہ السلام کا بیٹا کہا گیا ہے۔[2]

## دوسرا شبہ: مسیح کا 'اللہ تعالیٰ کو باپ قرار' دینا

جناب مسیح علیہ السلام نے کئی مواقع[3] پر تاکیدی طور پر اللہ تعالیٰ کو اپنا باپ قرار دیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے پیدا ہوئے ہیں اور اس صورت میں وہ بھی اپنے باپ کی طرح خدا ہوئے۔

جواب

① اوّل: اناجیل سے واضح ہوتا ہے کہ جناب مسیح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو جہاں 'اپنا باپ' کہا ہے وہاں کئی مرتبہ ایمان والوں کا بھی باپ قرار دیا ہے، مثلاً متی کے چھٹے باب میں بارہ مرتبہ یہ بات آئی ہے بلکہ فقرہ نمبر ۹ میں مسیحیوں کی نماز ہے جس کی ابتدا یوں ہے: "اے ہمارے باپ! تو جو آسمان پر ہے۔"

مزید حوالہ جات یہ ہیں: متی ۱۰:۲۹ لوقا ۶:۳۶ لوقا ۱۲:۳۱-۳۲ یوحنا ۲۰:۱۷

اگر اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کا باپ ہے، اس وجہ سے وہ خدا بنتے ہیں تو پھر سب ایمان والے بھی خدا ہوئے اور یہ بات اتفاقی طور پر باطل ہے لہٰذا لامحالہ انجیل کی اصطلاح کے مطابق ہی باپ کا معنی لیا جائے گا یعنی "پیار و محبت اور شفقت کرنے والا لوگوں سے خیر و بھلائی کا ارادہ کرنے والا ان کی راہنمائی کرنے والا۔"

② دوم: لفظ 'باپ' کا معنی راہبر و راہنما اناجیل سے ہی ثابت ہوتا ہے، چنانچہ ایک موقع پر یہودیوں اور مسیح علیہ السلام کا مکالمہ ہوا تو یہودیوں نے اپنا باپ خدا کو کہا لیکن جناب عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

"اگر خدا تمہارا باپ ہوتا تو تم مجھ سے محبت رکھتے... تم اپنے باپ ابلیس سے ہو اور اپنے باپ کی خواہشوں کو پورا کرنا چاہتے ہو۔"[4]

یہود جو کہ عیسیٰ علیہ السلام کو پکڑ کر قتل کرنا چاہتے تھے اور ان کے منکر تھے وہ چونکہ شیطان کے بہکاوے میں

---

۱ پیدائش ۲۲:۱-۱۲

۲ پیدائش ۱۶:۱۵

۳ انجیل یوحنا میں تو کثیر تعداد میں اللہ تعالیٰ کو 'باپ' کہہ کر پکارا گیا ہے اور انجیل متی ۷:۲۱، متی ۱۱:۲۷، متی ۲۴:۳۶، لوقا ۲۳:۳۴، لوقا ۲۳:۴۶

۴ انجیل یوحنا ۸:۴۲-۴۴

آئے تھے، اس لیے جناب عیسیٰ علیہ السلام نے 'شیطان کو ان کا باپ' کہا۔

مزید وضاحت پولوس نے کرنتھیوں کی طرف پہلا خط لکھتے ہوئے کی:

"میں تمھیں شرمندہ کرنے کے لیے یہ باتیں نہیں لکھتا، بلکہ اپنے پیارے فرزند جان کر تم کو نصیحت کرتا ہوں کیونکہ اگر مسیح میں تمہارے اُستاد دس ہزار بھی ہوتے تو بھی تمہارے باپ بہت سے نہیں، اس لیے کہ میں ہی انجیل کے وسیلہ سے مسیح یسوع میں تمہارا باپ بنا۔"[1]

پولوس اپنے آپ کو راہبر و مقتدیٰ قرار دے رہا ہے، نہ کہ حقیقی ولدیت بتائی جا رہی ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے ہمارے معاشرے میں 'استاد کو باپ' کہہ دیا جاتا ہے۔

③ سوم: بائبل میں فقط عیسیٰ علیہ السلام نے ہی اللہ تعالیٰ کو 'اپنا باپ' یا 'میرا باپ' کہہ کر نہیں پکارا بلکہ کئی انبیا سے ایسا ملتا ہے، لہٰذا اگر کسی کے ذہن میں لفظ 'اپنا' یا 'میرا' سے شک پیدا ہوتا ہے تو یاد رکھ لے کہ یہ نہایت کمزور اور تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ ناپائیدار دلیل ہے۔ حوالہ جات ملاحظہ فرمائیں:

اللہ تعالیٰ نے داود علیہ السلام کے حوالے سے فرمایا کہ:

"وہ مجھے پکار کر کہے گا: تو میرا باپ میرا خدا اور میری نجات کی چٹان ہے۔"

آگے خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اور میں اس کو اپنا پہلوٹھا بناؤں گا۔"[2]

یسعیاہ نبی نے خدا تعالیٰ کو یوں مخاطب کیا: "یقیناً تو ہمارا باپ ہے اگرچہ ابراہام ہم سے ناواقف ہو اور اسرائیل ہم کو نہ پہچانے۔ تو اے خداوند! ہمارا باپ اور فدیہ دینے والا ہے۔"[3]

اسی کتاب کے اگلے باب میں اس طرح ہے:

"اے خداوند! تو ہمارا باپ ہے۔ ہم مٹی ہیں اور تو ہمارا کمہار ہے۔"[4]

④ یہ تو انبیا کی بات ہے۔ عام انسانوں نے بھی اللہ تعالیٰ کو اپنا باپ کہا ہے: مثلاً یہودیوں نے ایک موقع پر جناب عیسیٰ علیہ السلام کو ان الفاظ میں جواب دیا تھا: "ہمارا ایک باپ ہے یعنی خدا۔"[5]

⑤ اسی طرح مسیحیوں کی نماز کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

"اے ہمارے باپ! تو جو آسمان پر ہے۔"[6]

---

۱ ۱-کرنتھیوں ۴:۱۴-۱۵

۲ زبور ۸۹:۲۶-۲۷

۳ یسعیاہ ۶۳:۱۶

۴ یسعیاہ ۶۴:۸

۵ انجیل یوحنا ۸:۱۴

۶ انجیل متی ۶:۹

پولوس نے کئی مرتبہ خدا تعالیٰ کو ہمارے باپ خدا کہہ کر یاد کیا ہے۔[1]
لامحالہ ان انبیا اور دیگر لوگوں کا مقصد مجازی تھا نا کہ حقیقی۔

جناب عیسیٰ علیہ السلام جو کہ یہودیوں کو مخاطب کرتے تھے ان کی کتاب کو جانتے اور ان کے محاورے کو پہچانتے تھے، انھوں نے بھی مجازی لحاظ سے اس نسبت کو بولا، ورنہ ضرور کسی موقع پر اس کی وضاحت کر دیتے، کیونکہ انبیا کے آنے کا مقصد ہی لوگوں کے عقائد و نظریات کو درست کرنا ہوتا ہے، مزید شکوک و شبہات میں ڈالنا نہیں، اور اگر پورے تبلیغی دور (جو تین سال پر محیط تھا) میں یہودیوں کو ذرا سا بھی شک ہوا تو انھوں نے فوراً جناب عیسیٰ علیہ السلام کو پتھروں سے سنگ سار کرنا چاہا لیکن حضرت عیسیٰ نے وضاحت کر کے معاملہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی، جس کی تفصیل اگلے شبہ کے تحت آ رہی ہے۔

## تیسرا شبہ: مسیح کا قول: "میں اور باپ ایک ہیں۔"

مسیحیوں کی طرف سے جناب مسیح علیہ السلام کے اس قول کو خوب اچھالا جاتا ہے اور انہیں الٰہ کے مرتبہ پر فائز کیا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا تھا: "میں اور باپ ایک ہیں۔"[2]

جواب: اس جملے کو اگر اسی حد تک پڑھیں تو واقعی عام آدمی پریشان ہو سکتا ہے لیکن اگر اصول کے مطابق اس کو سیاق و سباق کے ساتھ پڑھیں تو پھر حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے۔ مکمل عبارت یوں ہے:

"یروشلیم میں عیدِ تجدید ہوئی اور جاڑے کا موسم تھا۔ اور یسوع ہیکل کے اندر سلیمانی برآمدہ میں ٹہل رہا تھا۔ پس یہودیوں نے اس کے گرد جمع ہو کر اس سے کہا: تو کب تک ہمارے دل کو ڈانوانڈول رکھے گا؟ اگر تو مسیح ہے تو ہم سے صاف کہہ دے۔ یسوع نے انہیں جواب دیا کہ میں نے تو تم سے کہہ دیا مگر تم یقین نہیں کرتے۔ جو کام میں اپنے باپ کے نام سے کرتا ہوں، وہی میرے گواہ ہیں۔ لیکن تم اس لیے یقین نہیں کرتے کہ میری بھیڑوں میں سے نہیں ہو۔ میری بھیڑیں میری آواز سنتی ہیں اور میں اُنہیں جانتا ہوں اور وہ میرے پیچھے پیچھے چلتی ہیں۔ اور میں اُنہیں ہمیشہ کی زندگی بخشتا ہوں اور وہ ابد تک کبھی ہلاک نہ ہوں گی اور کوئی اُنہیں میرے ہاتھ سے چھین نہ لے گا۔ میرا باپ جس نے مجھے وہ دی ہیں، سب سے بڑا ہے اور کوئی اُنہیں باپ کے ہاتھ سے نہیں چھین سکتا۔ میں اور باپ ایک ہیں۔ یہودیوں نے اسے سنگ سار کرنے کے لیے پتھر اٹھائے۔ یسوع نے اُنہیں جواب دیا کہ میں نے تم کو باپ کی طرف سے بہتیرے اچھے کام دکھائے ہیں۔ ان میں سے کس کام کے سبب سے مجھے سنگ سار کرتے ہو۔ یہودیوں نے اسے جواب دیا کہ اچھے کام کے سبب سے نہیں بلکہ کفر کے سبب سے تجھے

---

1 رومیوں ۱:۷، ۱-کرنتھیوں ۱:۳، ۲-کرنتھیوں ۱:۲، افسیوں ۱:۲، فلپیوں ۱:۲، فلیمون ۱:۳
2 انجیل یوحنا ۱۰:۳۰

سنگ سار کرتے ہیں اور اس لیے کہ تو آدمی ہو کر اپنے آپ کو خدا بناتا ہے۔ یسوع نے انہیں جواب دیا کہ تمہاری شریعت میں یہ نہیں لکھا ہے کہ میں نے کہا تم خدا ہو؟ جبکہ اس نے اُنہیں خدا کہا جن کے پاس خدا کا کلام آیا (اور کتاب مقدس کا باطل ہونا ممکن نہیں)۔ آیا تم اس شخص سے جسے باپ نے مقدس کر کے دنیا میں بھیجا، کہتے ہو کہ تو کفر بکتا ہے، اس لیے کہ میں نے کہا میں خدا کا بیٹا ہوں؟ اگر میں اپنے باپ کے کام نہیں کرتا تو میرا یقین نہ کرو۔ لیکن اگر میں کرتا ہوں تو گو میرا یقین نہ کرو مگر ان کاموں کا تو یقین کرو تا کہ تم جانو اور سمجھو کہ باپ مجھ میں ہے اور میں باپ میں۔ اُنہوں نے پھر اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔"[1]

① جناب مسیح علیہ السلام نے کس قدر واضح الفاظ میں تشریح کر دی کہ 'میرا اپنے آپ کو خدا کے ساتھ ایک' کہنے یا 'خدا کا بیٹا' کہنے کا مطلب اسی طرح کا ہے جس طرح کہ اسی شریعت میں انبیا کو خدا کہہ کر پکارا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کو اس کے سبب نہ تو حقیقی خدا مانا گیا، نہ ہی اُنھوں نے لوگوں کو اس کی تبلیغ کی اور نہ ان پر کفر لازم آیا، لہٰذا میں بھی نہ تو کفر کہہ رہا ہوں اور نہ ہی قتل کی سزا کا مستحق ہوں۔

نوٹ: انبیاء علیہم السلام کو خدا کہہ کر پکارنے والی بات زبور میں ہے۔[2]

② جناب مسیح علیہ السلام نے 'میں اور باپ ایک ہیں' کی مزید تشریح کرتے ہوئے یہودیوں کو کہا کہ مجھ پر اس لیے تم کفر کا فتویٰ لگاتے ہو کہ میں نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا ہے یعنی انھوں نے ایک ہونے والے جملے کے باوجود اپنے آپ کو ہر لحاظ سے باپ (خدا) کے برابر قرار نہیں دیا بلکہ اپنا رتبہ ان سے نیچے ہی رکھا یعنی (بیٹا) کہا، ورنہ کسی ایک موقع پر ہی کبھی انھوں نے اپنے آپ کو باپ کہا؟ ہر گز نہیں۔ معلوم ہوا کہ زیر بحث جملے کا مفہوم و مطلب وہ نہیں جو کشید کیا جا رہا ہے۔

③ یہ بات بھی قابل غور ہے اگر جناب مسیح علیہ السلام واقعی حقیقی خدا یا خدا کے حقیقی بیٹے تھے تو اُنہیں واضح الفاظ میں اس کا اقرار کرنا چاہیے تھا، یہی موقع تھا کیونکہ یہودیوں نے ان کے جملے (میں اور باپ ایک ہیں) سے حقیقی دعویٰ ہی سمجھا تھا لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کی تردید کی اور ان الفاظ کو مجازی معنی میں استعمال کر کے باقاعدہ زبور سے دلیل بھی دی۔ اگر مسیحیوں کا استدلال تسلیم کریں تو ثابت ہوتا ہے جناب مسیح علیہ السلام نے یہودیوں کو دھوکے میں رکھا ہے ان کے سامنے دعویٰ کو واضح نہیں کیا اور ان کے ساتھ مغالطہ انگیزی سے کام لیا۔ نعوذ باللہ من ذلک!

④ یہ بھی معلوم ہوا کہ جناب مسیح علیہ السلام نے اپنے اوپر 'خدا کا بیٹا' اور 'خدا مجھ میں ہے۔' وغیرہ جملے اللہ تعالیٰ کا اُنہیں رسول مقرر کرنے کے سبب بولے تھے یعنی وہی بات کہ یہ الفاظ محبوب پیارے اور مقرب کے

---

1 انجیل یوحنا: ۱۰: ۲۲ تا ۳۹ 2 زبور ۸۲: ۶

مفہوم میں ہیں، نہ کہ حقیقی معنی میں۔

⑤ 'ایک ہونے والی بات' جناب مسیح علیہ السلام نے اپنے حواریوں اور ان کے شاگردوں کے حوالے سے بھی کی ہے تو کیا ان سب کو ہر لحاظ سے اللہ تعالیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام کے برابر قرار دیا جائے گا؟ اور کیا حواریوں کے شاگردوں کو کسی لحاظ سے ان کی برابری مل سکتی ہے؟ اسی انجیل یوحنا میں لکھا ہے:

"میں صرف ان (حواریوں) ہی کے لیے درخواست نہیں کرتا بلکہ ان کے لیے بھی جو ان کے کلام کے وسیلہ سے مجھ پر ایمان لائیں گے تاکہ وہ سب ایک ہوں یعنی جس طرح اے باپ تو مجھ میں ہے اور میں تجھ میں ہوں، وہ بھی ہم میں ہوں اور دنیا ایمان لائے کہ تو ہی نے مجھے کو بھیجا ہے اور وہ جلال جو تو نے مجھے دیا ہے میں نے اُنہیں دیا ہے تاکہ وہ ایک ہوں جیسے ہم ایک ہیں۔ میں ان میں اور تو مجھ میں تاکہ وہ کامل ہو کر ایک ہو جائیں۔"[1]

کیا مسیح یہ دعا مانگ رہے تھے کہ میرے شاگرد اور انکے شاگرد سب خدا بن جائیں؟ لاحول ولا قوۃ الا باللہ

لامحالہ ایسا مفہوم لیا جائے گا جو تمام عبارات کے موافق ہو اور وہ ہے مقصد اور ہدف میں ایک ہونا، نہ کہ ہر لحاظ سے ایک ہونا۔ عام محاورہ بھی اسی طرح ہے یعنی جب مقصد اور ہدف ایک ہو تو کہا جاتا ہے کہ "میں اور وہ ایک ہیں۔" اسی باب کے فقرہ ۱۱ کو پڑھیں تو مزید وضاحت ہو جاتی ہے، مسیح علیہ السلام کہہ رہے ہیں: "میں آگے کو دنیا میں نہ ہوں گا مگر یہ (حواری) دنیا میں ہیں اور میں تیرے پاس آتا ہوں، اے قدوس باپ! اپنے اس نام کے وسیلہ سے تو نے مجھے بخشا ہے، ان کی حفاظت کر تاکہ وہ ہماری طرح ایک ہوں۔"

⑥ پولوس نے بھی 'ایک ہونے والی' اصطلاح استعمال کی ہے اور اس نے بھی مجازی مفہوم لیا ہے نہ کہ حقیقی، چنانچہ کرنتھیوں کے نام پہلے خط میں یوں لکھا ہے:

"کیا تم نہیں جانتے جو کوئی کسی سے صحبت کرتا ہے وہ اس کے ساتھ ایک تن ہو جاتا ہے؟ کیونکہ وہ فرماتا ہے کہ وہ دونوں ایک تن ہوں گے اور جو خداوند کی صحبت میں رہتا ہے، وہ اس کے ساتھ ایک روح ہوتا ہے۔"[2]

اسلام میں بھی اسی طرح کا مفہوم ملتا ہے، چنانچہ حدیثِ قدسی ہے جسے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:.....

"میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو پسند کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ سنتا ہے۔ اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس کے ذریعے وہ دیکھتا ہے۔ اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ پکڑتا ہے۔

---

۱ انجیل یوحنا ۱۷: ۲۰-۲۳ ۲ ۱-کرنتھیوں ۶: ۱۶-۱۷

اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے... الخ"[1]

بلاشبہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس انسان کے اندر حلول کر جاتا ہے یا بعینہٖ جسم کے اعضا بن جاتا ہے بلکہ یہ مفہوم ہے کہ جب انسان عبادتِ الٰہی میں نہایت جدوجہد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو خاص ملکہ اور تعاون ملتا ہے جس کے ذریعے وہ اپنے اعضا کو اطاعتِ الٰہی میں مگن رکھتا ہے۔

بائبل سے مزید حوالہ جات جن میں 'ایک ہونے' سے حقیقی معنی نہیں مراد لیا گیا:

⑦ "اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی بیوی سے ملا رہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے۔"[2]

⑧ پولوس رقم طراز ہے: "اور تم سب جتنوں نے مسیح میں شامل ہونے کا بپتسمہ لیا مسیح کو پہن لیا، نہ کوئی یہودی رہا نہ کوئی یونانی نہ کوئی غلام نہ کوئی آزاد نہ کوئی مرد نہ کوئی عورت کیونکہ تم سب مسیح یسوع میں ایک ہو۔"[3]

⑨ "اور انجیل کے ایمان کے لیے ایک جان ہو کر جانفشانی کرتے ہو۔"[4]

⑩ "پس اگر کچھ تسلی مسیح میں اور محبت کی دل جمعی اور روح کی شراکت اور رحم دلی اور دردمندی ہے تو میری یہ خوشی پوری کرو کہ ایک دل ہو کر رہو، یکساں محبت رکھو، ایک جان ہو۔"[5]

⑪ "کیونکہ ہم سب نے خواہ یہودی ہوں، خواہ یونانی، خواہ غلام، خواہ آزاد ایک ہی روح کے وسیلہ سے ایک بدن ہونے کے لیے بپتسمہ لیا۔"[6]

## چوتھا شبہ: قول عیسیٰ علیہ السلام "میں باپ میں ہوں اور باپ مجھ میں"

عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا: "میں باپ میں ہوں اور باپ مجھ میں ہے۔"[7]

جواب: یہ اور اس طرح کی عبارات سے مسیحیوں کا استدلال نہایت کمزور ہے کیونکہ

اول: اگر اس جملے کو ظاہر پر محمول کیا جائے تو حلول کا ثبوت لازم آتا ہے جبکہ مسیحی حضرات اس کی نفی کرتے ہیں تو لامحالہ اس کی تاویل کرتے ہیں اور وہ یہ کہ باپ اور بیٹا جوہر میں متحد ہیں یعنی ظاہری لفظ سے گو دو شخصیات ہیں لیکن باطنی اعتبار سے دونوں ایک ہیں کیونکہ ظاہری لفظ سے باپ کا اطلاق بیٹے پر اور بیٹے کا باپ پر نہیں ہو سکتا۔ اور پیچھے یہ بحث تفصیلی گزر چکی ہے کہ باطن (لاہوت) کے اعتبار سے بھی دونوں کا ایک ہونا عقل

---

۱ صحیح بخاری: کتاب الرقاق، باب التواضع، رقم ۶۵۰۲

۲ پیدائش ۲:۲۴

۳ گلتیوں ۳:۲۷-۲۸

۴ فلپیوں ۱:۲۷

۵ فلپیوں ۲:۱-۲

۶ ۱-کرنتھیوں ۱۲:۱۳

۷ انجیل یوحنا ۱۴:۱۰

و نقل کے صریحاً خلاف ہے۔

دوم: سو جب ہم اس فقرے کے سیاق و سباق اور عہدِ جدید کے دیگر حوالہ جات کو دیکھتے ہیں تو اس کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً اسی باب کے فقرہ ۲۰ میں یوں لکھا ہے:

"اس روز تم جانو گے کہ میں اپنے باپ میں ہوں اور تم مجھ میں اور میں تم میں۔"

پچھلے شبہ کے تحت انجیل یوحنا کا ہی حوالہ گزرا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے شاگردوں کے لیے دعا کی تھی جس کے الفاظ یہ ہیں: "یعنی تاکہ وہ سب ایک ہوں یعنی جس طرح اے باپ تو مجھ میں ہے اور میں تجھ میں ہوں وہ بھی ہم میں ہوں... میں ان میں اور تو مجھ میں تاکہ وہ کامل ہو کر ایک ہو جائیں۔"[1]

ان عبارات کے مطابق: باپ ہے مسیح میں اور مسیح ہے شاگردوں میں۔ جس کا لازمی نتیجہ ہے کہ باپ ہے شاگردوں میں۔ اس کو منطق (لاجک) کی اصطلاح میں یوں سمجھیں کہ A برابر ہے B کے اور B برابر ہے C کے، لہٰذا A برابر ہوا C کے۔ کیا ہے کوئی مسیحی جو ان جملوں کے سبب حواریوں کو بھی خدا مانے؟

بائبل کے مزید حوالہ جات ملاحظہ فرمائیں:

"خدا کو کبھی کسی نے نہیں دیکھا، اگر ہم ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں تو خدا ہم میں رہتا ہے اور اس کی محبت ہمارے دل میں کامل ہو گئی ہے، چونکہ اس نے اپنے روح میں سے ہمیں دیا ہے۔ اس سے ہم جانتے ہیں کہ ہم اس میں قائم رہتے ہیں اور وہ ہم میں اور ہم نے دیکھ لیا ہے اور گواہی دیتے ہیں کہ باپ نے بیٹے کو دنیا کا منجی کر کے بھیجا ہے۔ جو کوئی اقرار کرتا ہے کہ یسوع خدا کا بیٹا ہے خدا اس میں رہتا ہے۔"

"اور وہ خدا میں، جو محبت خدا کو ہم سے ہے اس کو ہم جان گئے اور ہمیں اس کا یقین ہے، خدا محبت ہے اور جو محبت میں قائم رہتا ہے وہ خدا میں قائم رہتا ہے اور خدا اس میں قائم رہتا ہے۔"[2]

پولوس نے لکھا: "ہم زندہ خدا کا مقدس ہیں۔ چنانچہ خدا نے فرمایا کہ میں ان میں بسوں گا اور ان میں چلوں پھروں گا اور میں ان کا خدا ہوں گا اور وہ میری اُمت ہوں گے۔"[3]

ان حوالوں سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا ایمان والوں میں رہنا ان کی مدد و تعاون کرنا اور ان کے ارادے کو اپنے ارادے کے مطابق کرنا ہے۔ اگر اس اتحاد سے اُلوہیت لازم آتی ہے تو پھر تمام حواری، تمام اہل کرنتھیوں، بلکہ تمام نیک لوگ خدا ہوئے۔ اسی طرح جناب مسیح علیہ السلام میں خدا کے ہونے کا یہی مفہوم ہے کہ ان کا ہر قول و فعل اللہ تعالیٰ کی مشیت، تائید، محبت اور رضامندی سے ہے، نیز ان دونوں کا ہدف و ارادہ بھی ایک ہے۔

---

۱ انجیل یوحنا ۱۷: ۲۱-۲۳

۲ یوحنا کا پہلا خط ۴: ۱۲-۱۶ ۳ ۲-کرنتھیوں ۶: ۱۶

# دہشت گردانہ طرزِ فکر کے مغالطے اور ان کی وضاحت

ڈاکٹر شیخ عبدالرحمن السدیس حفظہ اللہ
امام کعبہ / چیئرمین ڈائریکٹوریٹ حرمین شریفین، مکہ

فضیلۃ الشیخ امام کعبہ حفظہ اللہ اپنی عظیم دینی ذمہ داری کے ساتھ سعودی حکومت میں بڑے اہم منصب 'حرمین شریفین کے ڈائریکٹوریٹ کے چیئرمین' کی ذمہ داری بھی ادا کر رہے ہیں۔ اس بنا پر آپ کی زیر نظر تحریر میں شریعتِ اسلامیہ کے ساتھ ساتھ سعودی حکومت کے موقف کی ترجمانی کا پہلو بھی ہے جو وہ دہشت گردی کے تناظر میں پیش نظر رکھتی ہے۔ مغالطوں کی وضاحت کے دوران اس اہم پہلو کو بھی ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔ ادارہ

گزشتہ شمارے میں دہشت گردی کا مفہوم اور اس کے اسباب کے بارے میں تفصیل گزری، اب یہاں ہم دہشت گردانہ فکر کے شبہات کی تردید پر گفتگو کریں گے جس کی وجہ سے وہ بڑے ہولناک جرائم میں ملوث ہو گئے۔ ان کے شبہات کی وضاحتیں ملاحظہ فرمائیں۔

## پہلا شبہ: حاکم وقت کی تکفیر

اس بے جان شبہ اور ان کی لاعلمی کی بنیاد پر حکام کے خلاف خروج کے فتنے نے جنم لیا اور انہیں اللہ تعالیٰ کے اس قول کو سمجھنے میں غلطی لگی:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝﴾ (المائدۃ: ۴۴)

"جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ کافر ہیں۔"

اہل علم نے اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں سیدنا عبداللہؓ بن عباسؓ کا یہ مشہور قول ذکر کیا ہے کہ

"اس آیت میں مذکور کفر سے وہ کفر مراد نہیں جو ایک انسان کے خون و مال کو حلال کر دے، بلکہ یہ اس سے کمتر کفر ہے۔"[1]

---

1 تفسیر ابن کثیر: ۳/۱۱۳

## تکفیر کی شرائط

لہٰذا انسان کو چاہیے کہ تکفیر سے باز رہے اور مندرجہ ذیل اہم شرطوں کے پائے جانے کے بعد ہی اس کی جرات کرے:

پہلی شرط: نصوص اس بات پر دلالت کریں کہ یہ چیز کفر اکبر اور ملت سے خارج کرنے والی ہے۔

دوسری شرط: حکم اسی شخص پر لاگو ہوتا ہو جس پر حکم لگانا مقصود ہو۔

تیسری شرط: وہ کلمۂ کفر صریحاً کفر ہو۔

اس کے علاوہ ان شرائط وضوابط کا بھی خیال ضروری ہے جو پہلے ذکر ہو چکی ہیں۔

اس لیے تکفیر کا حکم لگانے والے شخص کے لیے لازمی ہے کہ اسے شریعت کے قواعد و اصول کا علم اور نصوص کے مابین جمع و تطبیق کی صلاحیت ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ نصوص کے مقتضی سے وہ یہ واضح کرلے کہ یہ ملت سے خارج کرنے والا کفر ہے یا نہیں؟ یہ چیزیں اس کفر سے متصف شخص کی حالت پر غور و فکر کرنے کے بعد طے کرے کہ آیا اس شخص کے حق میں تکفیر کی شرطیں پوری ہو رہی ہیں یا نہیں؟ ان اہم چیزوں کا اس نازک مسئلے میں اعتبار کرنا ضروری ہے۔

## تکفیر کے موانع

تکفیر چونکہ شرعی حکم ہے، اس لیے اس میں شرائط کا پایا جانا اور موانع سے خالی ہونا ضروری ہے۔ تکفیر کی شرائط بیان کرنے کے بعد بہتر یہ ہے کہ اس کے موانع بھی ذکر کر دیے جائیں۔ چنانچہ سب سے پہلے اس شخص کی طرف کفر کی نسبت کی تحقیق کرلی جائے اور وہ خود بھی اس کفر کا اقرار کرے، اس پر حجت قائم کی جائے اور اسے اس کے بارے میں پورا اختیار اور مہلت دے کیونکہ بسا اوقات کفر کے مرتکب شخص میں درج ذیل تین موانع میں سے کوئی ایک مانع پایا جاتا ہے:

۱۔ جہالت: بسا اوقات کفر کا مرتکب شخص جاہل ہوتا ہے اور اسے مسئلے میں شرعی حکم سے واقفیت نہیں ہوتی۔

۲۔ تاویل: بسا اوقات وہ تاویل کرتا ہے اور معاملے کو ایسے حکم پر محمول کرتا ہے جو صحیح شرعی حکم نہیں ہوتا۔

۳۔ اکراہ: کبھی وہ مجبوراً اس فعل کا مرتکب ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے:

﴿ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ ﴾ (النحل:۱۰۶)

"مگر جس شخص کو مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو (تو کوئی حرج نہیں)۔"[1]

سلف کے نزدیک تکفیر کے یہ تین موانع ہیں، اس لیے کسی شخص کا مؤاخذہ اس کے گناہ کی وجہ سے نہیں کیا جائے گا مگر بعد اس کے کہ اس کے سامنے حجت واضح کر دی جائے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا﴾ (بنی اسرائیل:۱۵)

"اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ (لوگوں کو حق و باطل کا فرق سمجھانے کے لیے) ایک پیغمبر نہ بھیج دیں۔"

اللہ تعالیٰ کا ایک اور ارشاد ہے:

﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ حَتَّىٰ يَبْعَثَ فِي أُمِّهَا رَسُولًا﴾ (القصص:۵۹)

"اور تیرا ربّ بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا جب تک کہ ان کے مرکز میں ایک رسول نہ بھیج دیتا۔"

ابو واقد لیثیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب خیبر کی طرف نکلے تو راستے میں مشرکین کے ایک درخت کے پاس سے گزرے جسے 'ذاتِ انواط' کے نام سے جانا جاتا تھا، اس پر وہ لوگ اپنے ہتھیار لٹکایا کرتے تھے، تو صحابہ کرام نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ ہمارے لیے بھی ایک 'ذاتِ انواط' مقرر دیجیے جس طرح ان کے لیے ذاتِ انواط ہے۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا:

«سُبْحَانَ اللهِ هٰذَا كَمَا قَالَ قَوْمُ مُوسَى: ﴿اجْعَلْ لَنَا إِلٰهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ﴾ (الأعراف: 138) وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَتَرْكَبُنَّ سُنَّةَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ»[3]

"سبحان اللہ! یہ تو وہی بات ہو گئی جس طرح موسیٰ کی قوم نے ان سے کہا "آپ ہمارے لیے بھی ایک معبود بنا دیں جس طرح ان کے لیے ایک معبود ہے۔" قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم لوگ ضرور اپنے سے پہلے لوگوں کے طریقے پر چلو گے۔"

تکفیر کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ بہت زیادہ اس بات سے ڈرے کہ کہیں وہ ایسے شخص کی تکفیر نہ کر دے جس کی تکفیر اللہ اور اس کے رسول نے نہیں کی، ورنہ وہ حکم خود اسی پر لوٹ آئے گا، اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:

---

۱ تفسیر ابن کثیر: ۶/۶۰۵

۲ شروط التکفیر وموانعہ: مجموع الفتاوی: ۶/۵۸، ۱۲/۴۸۹

۳ سنن ترمذی، کتاب الفتن، باب ماجاء لترکبن سنن من کان قبلکم، حدیث ۲۱۸۰، امام ترمذی: حدیث حسن صحیح

«أَيُّمَا امْرِئٍ قَالَ لِأَخِيهِ "يَا كَافِرُ!" فَقَدْ بَاءَ بِهَا أَحَدُهُمَا. إِنْ كَانَ كَمَا قَالَ وَإِلاَّ رَجَعَتْ عَلَيْهِ»[1]

"جس نے بھی اپنے کسی بھائی کو 'اے کافر' کہہ کر بلایا تو ان دونوں میں سے کوئی ایک ضرور کافر ہو جاتا ہے۔ اگر واقعی مسئلہ ویسا ہی ہے جیسا اس نے کہا تب تو ٹھیک ہے، ورنہ یہ کفر اسی پر لوٹ آتا ہے۔"

امام غزالی[2] فرماتے ہیں:

"جہاں تک ہو سکے انسان کو تکفیر سے احتراز کرنا چاہیے، کیونکہ قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے والے اور صراحۃً لا إله إلا الله محمّد رسول الله کہنے والے کے خون اور مال کو حلال سمجھنا ایک غلطی ہے اور ایک ہزار کافروں کو زندگی بخشنے میں غلطی کرنا اس بات سے زیادہ آسان ہے کہ کسی مسلمان کے خون بہانے میں غلطی کی جائے۔"[3]

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

"یہی وجہ ہے کہ اہل علم و سنت اپنے مخالفین کی تکفیر نہیں کرتے، اگرچہ ان کے مخالفین ان کی تکفیر کرتے ہیں، کیونکہ کفر ایک شرعی حکم ہے اور کسی انسان کے لیے یہ روا نہیں ہے کہ اس کی مثل کے ذریعے بدلہ لے۔"[4]

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تکفیر ایک حکم شرعی ہے جس میں شرائط کا یقینی طور پر پایا جانا اور موانع سے خالی ہونا ضروری ہے۔

## دوسرا شبہ: حکام کے خلاف خروج کو جائز سمجھنے کا شبہ

اہل تکفیر کے بے سروپا شبہات میں سے، جن کی بنا پر وہ شرمناک افکار کا شکار ہوئے، ایک ظالم حاکم کے خلاف خروج کو جائز سمجھنا بھی ہے۔ اپنے زعم سے اس جواز کی دلیل انہوں نے یہ پیش کی کہ اس مسئلے میں سلف کے مابین اختلاف تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس مسئلے میں سلف کے مابین اختلاف اس وقت تھا جب کہ خروج

---

۱ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من أكفر أخاه بغير تاويل فهو كما قال، حدیث نمبر ۵۷۵۳،
صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان حال إیمان من قال لأخیه المسلم یا کافر!، حدیث نمبر ۶۰

۲ ابو حامد محمد بن محمد طوسی غزالی، لقب: حجۃ الاسلام ہیں۔ (ولادت طوس ۴۵۰ھ۔ وفات مصر ۵۰۵ھ) ان کی تقریباً دو سو تصنیفات ہیں، جن میں 'احیاء علوم الدین'، 'تہافت الفلاسفہ')، 'الاقتصاد فی الاعتقاد'، 'المستصفی من علم الاصول' وغیرہ مشہور ہیں۔

۳ 'الاقتصاد فی الاعتقاد': ۱۷۶، طبع: دار قتیبہ

۴ 'الرد علی البکری' از ابن تیمیہ: ۲/ ۴۹۲

کے نقصانات کھل کر ان کے سامنے نہیں آئے تھے، لیکن جب اُنہوں نے دیکھ لیا کہ خروج کوئی بھلائی نہیں لاتا تو وہ حکامِ وقت کے خلاف خروج ترک کرنے پر متفق ہوگئے، اگرچہ حکام ظلم وزیادتی کریں۔

امام بخاری کے عقیدہ کا ذکر کرتے ہوئے امام لالکائی اپنی سند سے امام بخاری سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

"میں نے حجاز، مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ، واسط، بغداد، شام و مصر کے ایک ہزار سے زائد اہل علم سے ملاقات کی، میں ان سے متعدد بار و قتاً فوقتاً ملتا رہا، چھیالیس سالوں سے زائد عرصہ سے میں نے ان کو ان کی زندگی میں پایا ہے۔ کئی سالوں میں شام، مصر اور جزیرہ والوں سے دو مرتبہ اور بصرہ والوں سے چار مرتبہ ملا، حجاز میں چھ سال اور کوفہ و بغداد نہ جانے کتنی بار گیا جس کا کوئی شمار نہیں، خراسان کے محدثین کے ساتھ ملا، جن میں..." پھر انہوں نے ان میں سے بعض ناموں کا ذکر کیا، پھر بعض اعتقادی مسائل کا ذکر کیا اور اسی ضمن میں امام بخاری کا یہ قول بھی نقل کیا: "وألّا ننازع الأمر أهله. کہ ہم حکمرانوں سے ان کی حکومت پر نہ لڑیں، وألّا یری السیف علی أمته محمد ﷺ. اور یہ کہ امّت محمدیہ ﷺ کے خلاف تلوار نہ اٹھائیں۔"[1]

اسی طرح لالکائی نے اپنی سند سے امام ابن ابی حاتم رازی[2] رحمہ اللہ سے ان کے والد اور ابوزرعہ رحمہما اللہ کے عقیدہ کا تذکرہ نقل کیا ہے کہ اُنہوں نے کہا:

"میں نے اپنے والد سے اور ابوزرعہ سے اُصولِ دین میں اہل سنت کے عقیدے کے بارے میں پوچھا اور یہ کہ تمام ممالک میں علما کو کس منہج پر پایا؟ تو ان دونوں نے کہا: ہم نے حجاز، عراق، شام اور یمن جیسے تمام ممالک میں علما کو پایا۔ ان کا عقیدہ یہ تھا... پھر بہت سارے اُمور کو ذکر کیا، جن میں ایک مسئلہ یہ تھا: اور ہم اماموں (حکمرانوں) کے خلاف خروج کو جائز نہیں سمجھتے اور نہ ہی فتنہ کے زمانے میں قتال کو جائز سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جس کو ہمارے معاملات کا ذمہ دار بنا دیا ہے، ہم اس کی سمع وطاعت کرتے ہیں، اس کی اطاعت سے ہاتھ نہیں کھینچتے، سنت اور جماعت کا اتباع کرتے اور شذوذ، اختلاف اور تفرقہ سے بچتے ہیں۔"[3]

---

۱ شرح اصول اعتقاد اہل السنۃ: ۲/۱۹۳ تا ۱۹۷، نمبر ۳۲۰

۲ أبو حاتم محمد بن ادریس بن منذر غطفانی حنظلی الرازی، حافظ المشرق، اسماء الرجال کے ماہر و مرجع۔ امام زہری کی احادیث کے جامع و مرتب (وفات ۲۷۵ھ)

۳ شرح اصول اعتقاد اہل السنۃ: ۲/۱۹۳ تا ۱۹۷، نمبر ۳۲۰

امام نووی رحمہ اللہ صحیح مسلم کی شرح میں لکھتے ہیں:

"اور جہاں تک مسئلہ ان (حکام وقت) کے خلافت خروج کرنے اوران سے قتال کرنے کا ہے تو یہ تمام مسلمانوں کے اجماع سے حرام ہے، اگرچہ وہ فاسق اور ظالم ہوں۔ جو میں نے ذکر کیا ہے اس معنیٰ کی حدیثیں واضح اور ظاہر ہیں۔" پھر لکھتے ہیں:

"قاضی نے کہا: ابو بکر بن مجاہد نے اس مسئلہ میں اجماع کا دعوی کیا ہے اور کچھ لوگوں نے یہ کہتے ہوئے ان کا رد کیا ہے کہ حضرت حسین، ابن زبیر رضی اللہ عنہما اور اہل مدینہ بنی اُمیہ کے خلاف کھڑے ہوئے، اسی طرح تابعین اور دور اوّل کے مسلمان ابن اشعث کے ساتھ مل کر حجاج کے خلاف کھڑے ہوئے۔ پھر لکھتے ہیں: قاضی نے کہا: "کہا گیا کہ یہ اختلاف شروع دور میں تھا، پھر ان کے خلاف خروج نہ کرنے پر اجماع ہو گیا۔"[1]

شاذونادر ہی کوئی ایسا امام ملے گا کہ جس نے اہل سنت کے عقیدہ پر کوئی کتاب لکھی ہو مگر اس نے ضرور بیان کیا کہ حکامِ وقت کے خلاف خروج نہ کیا جائے، اگرچہ وہ ظلم وزیادتی کریں اور معروف (بھلے کام) میں ان کی سمع وطاعت بجالائی جائے اور اُنہوں نے اس چیز کو اپنے اصول میں شمار کیا اور جو اس مسئلے میں ان کی مخالفت کرتا ہے تو وہ ہویٰ پرست وبدعتی ہے اور جماعت سے نکلنے والا ہے۔

علامہ ابوالحسن اشعری[2] رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"مسلمانوں کے اماموں (حکمرانوں) کی سمع وطاعت پر علما کا اجماع ہے اور اس بات پر بھی کہ ہر وہ شخص جو ان کے کسی معاملے کا والی بنا خواہ رضامندی کے ساتھ یا زبردستی اس کی حکومت قائم ہو گئی۔ خواہ وہ نیک ہو یا فاجر تو اس کے خلاف تلوار کے ذریعہ خروج نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ ظلم کرے یا عدل کرے۔"[3]

علامہ ابو بکر اسماعیلی[4] رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"علما کی رائے یہ ہے کہ ان ظالم حکمرانوں کے لیے اصلاح کی دعا کی جائے اور اس بات کی کہ وہ عدل کی

---

۱ شرح مسلم از نووی: ۲/ ۴۳۳، ۴۳۲

۲ ابوالحسن علی بن اسمٰعیل اشعری، مصنف: مقالات الاسلامیین، الإبانة عن أصول الديانة (وفات: ۳۲۴ھ)

۳ رسالة إلى أهل الثغر، ص ۲۹۷

۴ ابو بکر احمد بن ابراہیم اسماعیلی شافعی، امام اہل جرجان، مصنف: المستخرج على الصحيح، المعجم، مسند عمر، المسند الكبير (وفات ۳۷۱ھ)

طرف مائل ہوں۔ اوران کے خلاف تلوار سے خروج کو جائز نہیں سمجھتے۔"[1]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"دیے گئے علم وعدل کا تقاضا یہ ہے کہ حکام کے ظلم وجور پر صبر کیاجائے ،جیسا کہ یہ اہل سنت والجماعت کا اُصول ہے۔"[2]

پھر انہوں نے ایک طویل گفتگو کی، جس میں اُنہوں نے فرمایا:

"اسی لیے اہل سنت والجماعت کا اس بات پر اتفاق ہو گیا ہے کہ فتنہ کے زمانے میں قتال نہ کیا جائے کیونکہ اس سلسلے میں نبی ﷺ سے صحیح احادیث ثابت ہیں ،وہ اس مسئلے کو اپنے عقائد میں ذکر کرتے ہیں اور حکام کے ظلم پر صبر کرنے اوران سے قتال نہ کرنے کا حکم دیتے ہیں، اگرچہ فتنہ کے زمانے میں اہل علم ودین کی بڑی تعداد نے قتال کیا ہے۔ یہاں تک کہ اُنہوں نے یہ فرمایا: نبی ﷺ نے کسی کی تعریف نہیں کی، نہ فتنہ میں قتال کرنے پر، حکام کے خلاف خروج کرنے پر، ان کی اطاعت سے ہاتھ کھینچنے پر اور نہ ہی جماعت سے الگ ہونے پر۔"[3]

پھر انہوں نے حکام وقت کے خلاف خروج کے نقصانات کا فوائد کی نسبت بھاری ہونے کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

"اسی لیے اہل حدیث کا منہج یہ ہے کہ ظالم بادشاہوں کے خلاف قتال کے ذریعہ خروج نہ کیا جائے، ان کے ظلم پر صبر کیا جائے تا آنکہ نیک شخص کو راحت مل جائے یا فاجر سے نجات مل جائے۔"

اُنہوں نے یہ بھی فرمایا:

"اسی لیے اہل سنت والجماعت کے اصولوں میں سے یہ رہا کہ جماعت کو لازم پکڑا جائے، حکام سے قتال نہ کیا جائے اور فتنہ کے زمانے میں قتال سے باز رہا جائے۔ اور جہاں تک ہوی پرستوں کا مسئلہ ہے جیسے معتزلہ تو حکام کے خلاف قتال کو جائز سمجھنا ان کے اُصولِ دین میں شامل ہے۔"[4]

اُنہوں نے یہ بھی فرمایا:

"جہاں تک اہل علم وفضل اور دین کا مسئلہ ہے تو وہ کسی کو بھی حکام وقت کی نافرمانی کرنے، انہیں دھوکہ

---

۱ اعتقاد اہل السنۃ، ص ۵۰

۲ مجموع الفتاوی: ۲۸/۲۷۹

۳ مجموع الفتاوی: ۴/۵۲۷ تا ۵۳۰

۴ مجموع الفتاوی: ۴/۴۴۴

دینے اوران کے خلاف کسی بھی نوعیت کے خروج کرنے کی اجازت نہیں دیتے کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے، جیسا کہ متقدمین ومتاخرین اہل سنت اور دیگر لوگوں کی عادات اور کردار سے یہ بات معروف ہے۔"[1]

انہوں نے یہ بھی فرمایا:

"اس سلسلے میں اصول یہ ہے کہ کسی امام یا گروہ کے اندر صرف ظلم وزیادتی کا پایا جانا اس سے قتال کا موجب نہیں ہے، بلکہ جواز بھی فراہم نہیں کرتا۔ اس کے برعکس جس اصول پر نصوص دلالت کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ لوگوں کو اس بات کا حکم دیا جائے گا کہ وہ ظالم وجابر بادشاہ کے ظلم وجور اور زیادتی پر صبر کریں اور اس سے قتال نہ کریں۔"[2]

ان روشن نصوص و براہین سے سارا ابہام وغموض دور ہو جاتا اور شبہ زائل ہو جاتا ہے اور اس جاہل فکر کا عیب واضح ہو جاتا ہے جو حکام کے خلاف خروج جائز قرار دیتی ہے اور اُمتِ مسلمہ کو کشمکش، اختلاف، انتشار اور تباہی کی آگ میں جھونک دیتی ہے۔[3]

## تیسرا شبہ: ہاتھ اور ہتھیار سے منکر کو بدلنے کا شبہ

امر بالمعروف ونہی عن المنکر شریعت کے اُصولوں میں سے ایک عظیم ترین اصول ہے، اسی سے شریعت کے ارکان مضبوط ہوتے ہیں، اس کی عمارت بلند ہوتی ہے اور اسی سے اُمتِ مسلمہ کو 'خیر امت' کا درجہ ملا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللهِ ﴾

"تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے برپا کی گئی ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔" (آل عمران:۱۱۰)

اس عظیم دینی شعار کے کچھ شروط، آداب وضوابط اور مقاصد ہیں جنہیں مکمل طریقہ سے پورا کرنا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس سلسلے میں وارد نصوص کو سب سے درست معنی اور سب سے پاکیزہ فہم پر محمول کیا جائے، ان کی پریشانی اس شعار کے تئیں ان کی کمزور سوچ اور الٹے قول کی وجہ سے ہے جو کھلم

---

۱ مجموع الفتاوی: ۳۵/ ۱۲

۲ الاستقامہ: ۱/ ۳۲ اور منہاج السنۃ: ۳/ ۳۹۱

کھلا روشن شرعی احکام کے مخالف ہے، جس کی چند مثالیں ذیل میں بیان کی جارہی ہیں:

انہوں نے اللہ کے رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کو غلط ڈھنگ سے سمجھا:

«مَنْ رَأَى مِنكُمْ مُنكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ » وفي رواية: «وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْإِيمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ»[1]

"تم میں سے جو بھی کسی منکر کو دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے بدلے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو اپنی زبان سے اسے بدلے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو اسے اپنے دل میں برا جانے اور یہ سب سے کمتر ایمان ہے۔" ایک دوسری روایت میں ہے: "اور اس کے بعد ذرہ برابر بھی ایمان نہیں ہے۔"

ان کو یہ جواب دیا جائے گا کہ اپنی جانب سے چیزوں کو ان کے حقیقی نام کو چھوڑ کر ایسا نام نہ دیا جائے جو فساد کا باعث ہو یا شریعت کے مخالف ہو۔ ایسا کرنا نہ اہل علم کا قول ہے، نہ اہل فضل کا عمل ہے، نیز اللہ نے جن لوگوں کو دین میں بصیرت سے نوازا ہے، ان کے ہاں یہ چیز حقیقت کو کچھ بھی بدل نہیں سکتی، کیونکہ جلیل القدر علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایسا منکر جو اپنے سے بڑے منکر کو جنم دے، اس کی نکیر نہیں کی جائے گی، کیونکہ شریعت کی بنیاد اس بات پر ہے کہ مصلحتیں حاصل کی جائیں اور مفاسد کم کیے جائے۔

اس پر قدآور علمائے کرام کے اقوال دلالت کرتے اور ابھارتے ہیں چنانچہ

امام نووی رحمہ اللہ نے قاضی عیاض رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے:

"اگر غالب گمان یہ ہو جائے کہ ہاتھ سے منکر کو بدلنے کی صورت میں اس سے بڑا منکر پیدا ہو جائے گا جیسے اس کے یا کسی اور کے قتل ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں ہاتھ سے روکنے کے بجائے زبان کے ذریعہ سے بات کہنے اور وعظ و نصیحت کرنے اور خوف پیدا کرنے پر اکتفا کرے۔ پھر اگر یہ ڈر ہو کہ زبانی نصیحت سے بھی اسی قسم کا خطرہ ہے تو پھر وہ اپنے دل سے برا جانے، اس طرح وہ وسعت میں رہے گا۔ یہی حدیث کا مفہوم ہے۔"[2]

واللہ! یہی مشکاۃ نبوت کے فہم سے پیدا ہونے والا نور ہے اور اللہ کی حرمتوں اور اس کے احکامات کے سلسلے میں پرہیز گاری اختیار کرنے کی راحت اور سکون ہے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا:

---

۱ صحیح مسلم، کتاب الإیمان، حدیث نمبر ۴۹

۲ شرح صحیح مسلم از نووی: ۱/۳۰۱

"کسی منکر کا انکار کسی ایسے وسیلے سے کرنا جو اس سے بڑا منکر ہو، جائز نہیں ہے، اس لیے امر بالمعروف والنہی عن المنکر کی خاطر حکام کے خلاف تلوار لے کر نکلنے کو جرم قرار دیا گیا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے محرمات کے ارتکاب اور واجبات کے ترک کی ایسی برائی لازم آئے گی جو کہ حکام کی جانب سے صادر ہونے والے منکر اور گناہ سے کہیں بڑھ کر ہے۔"[1]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ

"ابو مطیع حکم بن عبداللہ نے ان سے پوچھا: اس شخص کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو بھلائی کا حکم دے اور منکر سے روکے، جس پر کچھ لوگ اس کے پیروکار بن جاتے ہیں اور پھر وہ جماعت کے خلاف خروج کرے، تو کیا آپ اس کو جائز سمجھتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: نہیں، میں نے کہا: کیوں جب کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا ہے اور یہ واجب فریضہ ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: بات تو صحیح ہے لیکن خون بہانے اور حرام کو حلال سمجھنے کی صورت میں جو بگاڑ وہ کریں گے، وہ ان کی اصلاح سے زیادہ ہو گا۔"[2]

علامہ ابن جوزی[3] رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"حکام و سلاطین کے ساتھ امر بالمعروف والنہی عن المنکر کے سلسلے میں جو طریقہ درست ہے وہ یہ ہے کہ ان کو آگاہ کیا جائے اور انہیں وعظ و نصیحت کی جائے اور ایسے سخت الفاظ استعمال کرنا، مثلاً: اے ظالم! اے اللہ سے نہ ڈرنے والے! وغیرہ اس قسم کے الفاظ ایسا فتنہ بھڑکاتے ہیں جس کا شر دوسرے لوگوں تک پہنچتا ہے، تو جائز نہیں ہے۔ اور اگر کہنے والے کو صرف اپنے نفس پر خطرہ ہو تو جمہور علما کے نزدیک جائز ہے لیکن میں ایسا کرنے سے بھی منع کرتا ہوں، کیونکہ اصل مقصود منکر کو ختم کرنا ہے اور حاکم کے خلاف زبان درازی کر کے اسے منکر کے ارتکاب پر ابھارنا اس منکر سے بڑھ کر ہے جس کو اس نے زائل کرنے کا قصد کیا ہے۔"

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"حاکم سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی جائے گی، کیونکہ اس کی تلوار اور تازیانہ ہمیشہ تیار رہتے ہیں اور سلف

---

۱ مجموع الفتاوی: ۱۴/ ۴۷۲

۲ مجموع الفتاوی: ۵/ ۴۷

۳ امام عبد الرحمن بن علی بن محمد قرشی تیمی بغدادی حنبلی ابن الجوزی، مختلف علوم میں متعدد تصانیف لکھیں۔ (وفات ۵۹۷ھ)

کے بارے میں جو یہ آتا ہے کہ وہ اپنے سلاطین کا سامنا کرتے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے دل میں علما کی ہیبت تھی۔ اس لیے جب علما ان کے خلاف بولتے تھے تو اکثر حالتوں میں وہ انہیں انگیز کر لیتے تھے۔"[1]

ان دلائل وآثار سے ان کا شبہ ظاہر ہو گیا جس نے ان کے مفاسد اور باطل کو ان پر ملتبس کر دیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ انتہا پسند جماعت نے پورے اصرار کے ساتھ اہل سنت والجماعت کے اجماع سے تصادم کیا ہے اور امر بالمعروف والنہی عن المنکر کے سلسلے میں ان کے حق اور درست منہج کی مخالفت کی ہے جس کی اصل وتفصیل اوّل وآخر اور باطن وظاہر سراسر شفقت علم وحکمت اور بردباری پر مبنی ہے۔ کاش کہ یہ غلو پسند اور سنگ دل لوگ ان شفقت آمیز اُصول، اخلاق اور عمدہ خصلتوں اور اقدار کو تھوڑا بھی اپنائے ہوتے!!

## چوتھا شبہ: آج دفاعی جنگ کا مرحلہ ہے جس کے لیے استطاعت کی کوئی شرط نہیں!

ان کے اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ عالمی نظاموں، بین الاقوامی عہد وپیمان اور معاہدوں کی موجودگی میں کس نے یہ طے کیا کہ اُمت آج دفاعی جہاد کے مرحلے میں ہے؟!! آیا اس مرحلے کا فیصلہ فقہ اکیڈمیوں اور اسلامی تنظیموں نے کیا یا ربانی علما نے کیا!!... یا یہ نوخیز کم علم اور عام لوگوں کا فیصلہ ہے!!

ہاں، یہ درست ہے کہ دفاعی جہاد شرعی واجبات میں سے ایک اہم واجب ہے اور دفاعی جہاد کا مطلب یہ ہے کہ کسی زیادتی وظلم پر بطورِ بدلہ قتال کرنا، لیکن اس کی صحت اور وجوب کے لیے شرط ہے کہ یہ جہاد شرعی حکومت کی اجازت سے اور اس کے جھنڈے تلے ہو، نیز وہ قدرت واستطاعت سے مرتبط ہو اور اس بات سے بھی مرتبط ہو کہ یہ شر میں مزید اضافہ نہ کرے۔ اور اگر کوئی مسلمان کسی ایسے واجب کو ترک کر دیتا ہے جس کی قدرت اس کے پاس نہیں ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں وہ معذور ہو گا اور اللہ تعالیٰ اس کے لیے کوئی سبیل نکالے گا، کیونکہ وہ اس سلسلے میں اللہ سے ڈرنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝﴾ (الطلاق:۲)

"جو کوئی اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا۔"

مزید فرمایا: ﴿مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ۝﴾ (الطلاق:۴)

---

۱ الآداب الشرعیۃ از ابن مفلح: ۱/۱۹۷

"جو شخص اللہ سے ڈرے تو اللہ اس کے معاملہ میں آسانی پیدا کر دیتا ہے۔"

اسی طرح اگر علم کے حصول اور دعوت الی اللہ میں لگ جائے اور ہر آدمی اپنے اپنے میدان میں اپنی وسعت بھر اُمت کی طاقت کو دین کی خدمت کی جانب موڑ دے تو اس سے عمومی فائدہ ہو گا اور صحت مند سوچ پیدا ہو گی۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"جو شخص طاقت اور جہاد سے دین کو قائم کرنے کی طاقت نہیں رکھتا اور وہ کام کرتا ہے جس کی اسے قدرت ہے جیسے دل سے اُمت کے لیے خیر خواہی اور دعا، بھلائی سے محبت اور اپنی استطاعت بھر خیر کے کاموں کو انجام دیتا ہے تو اسے اس چیز کا مکلف نہیں کیا جائے گا جس کے کرنے سے وہ عاجز ہے کیونکہ دین کا قیام دو چیزوں سے ہے: ایک رہنمائی کرنے والی کتاب اور دوسری مدد کرنے والا لوہا (ہتھیار)۔"[1]

فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح عثیمین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں پر جہاد واجب ہے تاکہ اللہ کا کلمہ سربلند ہو اور دین پورا کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے، لیکن آج مسلمانوں کے پاس وہ اسباب نہیں ہیں جن کے ذریعہ وہ کافروں سے جہاد کر سکیں، حتی کہ دفاعی جہاد بھی نہیں اور ہجومی جہاد تو بلاشک آج کے دور میں ناممکن ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ایک باشعور اُمت کو پیدا کرے جو پہلے ایمانی اور نفسیاتی طور پر تیار ہو، پھر عسکری طور پر جہاد کے لیے تیار ہو مگر ہم اس موجودہ صورتحال کی موجودگی میں جہاد نہیں کر سکتے۔"[2]

دفاعی جہاد کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ ہمارے پاس دشمن کو روکنے کی طاقت ہو، اگر ہم طاقت اور ہتھیار میں ان سے کمتر ہیں اور پھر ہم ان کے طغیان و سرکشی کو بھڑکائیں اور اُنہیں اپنے وطن، اپنی عزت اور مال پر قبضہ جمانے کا موقع دیں، تو یہ جہاد نہیں ہے بلکہ یہ زمین پر فتنہ و فساد پھیلانے کے مترادف ہے اور ایسا کرنا واضح شریعت اور اس کے مسلمہ احکام کی خلاف ورزی ہے!!

## پانچواں شبہ: کفار کو جزیرۃ العرب سے نکالنے کا شبہ

اس شبہ کا جواب دینے سے پہلے اس مسئلے میں تھوڑی تفصیلی گفتگو کرنا بہتر ہے، وہ اس لیے کہ جزیرۃ العرب میں کافروں کے رہنے کی دو شکلیں ہیں: دائمی اور وقتی

---

۱ مجموع الفتاوی: ۲۸/۳۹۶

۲ من لقاء الخمیس: ۳۳، مجلس صفر ۱۴۱۴ھ منقول از 'مہمات فی الجہاد': ص ۱۷

دائمی قیام کرنا بایں طور کہ وہ اسے اپنا مستقل وطن بنالیں تو یہ جائز نہیں ہے اور اگر وقتی طور پر قیام کرتے ہیں تو جائز ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ﴾

"اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے (تاکہ اللہ کا کلام سنے) تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اسے اس کے (امن کی جگہ) تک پہنچا دو۔" (التوبہ:٦)

اور اس لیے بھی کہ دونوں خلفاے راشدین حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے کفار کو جزیرۃ العرب سے نکالنے میں جلدی نہیں کی، نیز جس شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قتل کیا تھا اور اس سے اُن کو شہادت کا اعزاز ملا۔ وہ شہادت جس کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی فرمائی تھی، وہ کافر ہی تھا۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کا قصہ نقل کیا ہے، اسی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی ہے:

"تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے مجھے کسی ایسے شخص کے ہاتھوں موت نہیں دی جو اسلام کا دعویٰ کرتا ہو۔"[1]

اس مسئلے میں ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ کفار کو جزیرۃ العرب سے نکالنے کی ذمہ داری کس کی ہے؟

اس وقت پوری دنیا میں اس بات پر اتفاق ہے کہ کسی بھی ملک میں اگر کوئی ایسا شخص داخل ہونا چاہتا ہے جو وہاں کا باشندہ نہیں ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس ملک کی حکومت سے اجازت حاصل کرے جسے ہم 'انٹری ویزا' کے نام سے جانتے ہیں، لہٰذا جو شخص بھی اس ویزا کے ساتھ کسی بھی ملک میں جاتا ہے تو اسے جان و مال کا امان حاصل ہوتا ہے اور اس کی خلاف ورزی اس شخص پر ناحق ظلم و زیادتی کر کے ہی ہو سکتی ہے۔

جو کفار جزیرۃ العرب میں داخل ہوئے ہیں، اُنہیں وہاں سے نکالنے کی ذمہ داری وہاں کے حکام کی ہے جن کی اجازت سے وہ وہاں داخل ہوئے ہیں، ان کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے لیے اس قسم کی کوئی کارروائی کرنا جائز نہیں ہے۔ اس لیے حکومت کے امان میں آنے والے بعض لوگوں کے خلاف جو بھی ظلم و زیادتی ہوتی ہے، خواہ قتل کے ذریعے ہو یا ایذا رسانی کے ذریعے یا اس سے کمتر کسی حرکت کے ذریعے، تو یہ سب اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے اور جرم، زمین میں فساد پھیلانے اور اسلام و مسلمانوں کی شبیہ بگاڑنے کے قبیل سے ہے۔

اس کی مزید وضاحت اس بات سے ہوتی ہے کہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے دورِ حکومت میں صحابۂ کرام میں سے کسی نے کفار کو جزیرۃ العرب سے نکالنے کو دلیل بنا کر کسی بھی کافر پر کسی قسم کی کوئی زیادتی

---

1 صحیح بخاری، کتاب فضائل الصحابۃ، باب قصة البيعة والاتفاق على عثمان بن عفان، حدیث نمبر ۳۴۹۷

نہیں کی، نہ تو قتل کے ذریعہ اور نہ ہی اس سے کمتر کسی اور سرگرمی کے ذریعہ، کیونکہ وہ اس بات سے واقف تھے کہ ان کو نکالنے کی ذمہ داری حکامِ وقت کی ہے۔''¹

اس مسئلے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جزیرۃ العرب سے مراد کیا ہے؟

اس سلسلے میں اہل علم کا اختلاف ہے، اس لیے اس مسئلے اور اس کے نتیجے میں امت کے اندر وجود پذیر ہونے والے بڑے بڑے مسائل میں فیصلہ کی ذمہ داری علمائے مجتہدین کی ہے نہ کہ عام افراد کی۔

جزیرۃ العرب کے امن وسکون اور اس میں فتنہ و فساد نہ برپا کرنے کے حوالے سے اگر شریعت کے مقاصد، جن میں مصالح کو حاصل کرنے، مفاسد کو روکنے اور انجام کا اعتبار کرنے کی دعوت ہے، کو مد نظر رکھا جائے تو صاف ظاہر ہو گا کہ ان دہشت گردانہ کارروائیوں کا انجام اس جزیرہ میں تخریب و تباہی اور خوف ودہشت کی شکل میں برآمد ہوا، جسے اللہ تعالیٰ نے امن و سلامتی اور صلاح و اصلاح کا گہوارہ بنانا چاہا، نہ کہ فتنہ وفساد کا اڈہ۔ اللہ عزوجل ہی سیدھے راستے کی رہنمائی کرنے والا ہے۔

## مقصد ششم: عقیدہ وَلاء وبَراء میں غلط فہمی

عقیدے سے متعلق وہ شبہات جن میں دین سے بعید گروہ ملوث ہے اور اُنہوں نے اسے گمراہی، فتنے اور غلو کی دلدل میں دھکیل دیا ہے، ان میں سے ایک مسئلہ عقیدے کے ایک اہم اصول کے معانی سے ان کی جہالت وعدم واقفیت ہے۔ اور وہ ولاء وبراء کا عقیدہ ہے، جس نے ان دونوں کی حدود سے تجاوز کیا، وہ نہایت ہی مذموم غلو کا شکار ہوا۔ اسی طرح جس نے ان میں کوتاہی کی اس نے بھی حد سے تجاوز کیا اور تفریط کا شکار ہوا۔

انتہا پسند فکر کے حاملین نے اسلامی معاشرہ سے اپنی براءت کا اظہار کیا ہے اور اس کی تکفیر کی ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں مسلم معاشرہ کفار کے ساتھ لین دین کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ ان لوگوں کی جماعت سے نکل گیا ہے جس کے بارے میں ان کا زعم ہے کہ وہی دراصل مسلمانوں کی وہ جماعت ہے جس کے بارے میں احادیثِ شریفہ میں ذکر آیا ہے حالانکہ

''یہ ان کے جھوٹ اور ان بناوٹی عقائد کا نتیجہ ہے جو انہوں نے گھڑ رکھے ہیں۔'' (الاحقاف:۲۸)

ان کی اس باطل پرستی کی دھجیاں اُڑاتے ہوئے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اور جس شخص کے اندر ایمان اور فسق وفجور دونوں ہوں، اس کے ایمان کے بقدر اس سے دوستی رکھی جائے گی اور اس کے فسق وفجور کے بقدر اس سے بغض رکھا جائے گا اور محض گناہ اور معصیت کی وجہ

---

۱ مجموع الفتاویٰ:۲۸/۸۹ اور بذل النصح والتذکیر لبقایا المفتونین والتفجیر :ص۱۸۔۱۹

سے اسے کلی طور پر ایمان سے نہیں نکالا جائے گا۔"[1]

ان کی لغزش اور کج فہمی کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے کفر وولاء کا غلط مفہوم لیتے ہوئے فروعی احکام کو ولاء وبراء کا محل بنالیا ہے۔ خیر کے ایسے اعمال جنہیں شرعی اصول و مسلمات سے چھیڑ چھاڑ کیے بغیر دنیوی مصلحتوں کی خاطر اور امن وسلامتی کی راہیں ہموار کرنے کے لیے انجام دیا جائے، شریعت ان کی اجازت دیتی ہے اور ان کی خواہاں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ ﴾ (الممتحنۃ:۸)

"اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں میں سے نہیں نکالا، اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

اس آیت کا مفہوم یہ کہ کفار میں سے جن لوگوں نے مسلمانوں کو تکلیف نہیں پہنچائی، نہ ان سے قتال کیا اور نہ اُنہیں ان کے گھروں سے نکالا، مسلمان ایسے لوگوں کے ساتھ دنیوی معاملات میں احسان اور عدل وانصاف کا برتاؤ کریں گے، کیونکہ صلہ رحمی اور حسن تعامل کافر کو اسلام میں راغب کرنے کا ذریعہ ہے، لیکن قلبی محبت اور دوستی نہ ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی اسی مفہوم پر دلالت کرتا ہے:

﴿ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ﴾ (الانفال:۶۱)

"اور اے نبی! اگر دشمن صلح وسلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو۔"

دنیوی اُمور میں غیر مسلموں کے ساتھ معاملہ کرنے کی بہت ساری مثالیں موجود ہیں، مثلاً ہجرت کے موقع پر نبی ﷺ نے عبداللہ بن اُریقط لیثی کو رہبر کے طور پر اُجرت پر رکھا تاکہ وہ راستہ کی رہنمائی کرے۔[2]

اسی طرح آپ ﷺ نے بعض یہودیوں سے قرض لیا ہے۔ نبی ﷺ کی وفات کے وقت آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس گروی رکھی ہوئی تھی[3]، اسی طرح نبی کریم ﷺ اپنے یہودی پڑوسی کو ہدیہ دیا کرتے تھے۔

---

۱ مجموع الفتاوی:۲۸/۲۲۷تا۲۲۹

۲ صحیح البخاری، کتاب الإجارة، باب استئجار المشرکین عند الضرورة إذا لم یوجد أهل الإسلام، حدیث۲۲۶۳

۳ السنن الکبری از بیہقی، کتاب البیوع، باب جواز الرهن، حدیث نمبر۱۰۹۷۴

آپ ﷺ نے خیبر کے یہودیوں کے ساتھ بھی معاملہ طے کیا کہ جو بھی غلہ اور پھل ہو گا، اسکا آدھا دینا ہو گا۔[1]

یہ تمام چیزیں اس بات کی دلیل ہیں کہ خرید و فروخت اور منافع کے تبادلے میں غیر مسلموں کے ساتھ معاملہ جائز ہے، چنانچہ ہم کفار کے ساتھ ان چیزوں میں خرید و فروخت کا معاملہ کرتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے، مثلاً: اشیائے خورونوش، کپڑے، اسلحہ اور اس کے علاوہ وہ نفع بخش اشیا جو مسلمانوں کے حق میں مفید ہیں، یہیں سے محض دنیوی تعامل اور عقیدے کی محبت اور دوستی کے درمیان فرق بھی واضح ہو جاتا ہے جس سے پختہ کار اہل علم بخوبی واقف ہیں، لیکن یہ جہالت، غلو اور نفس پرستی ہے جو ان چیزوں کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ پر، اُنہوں نے فرمایا:

"آپ بہت سارے لوگوں کو پائیں گے کہ وہ محض ذاتی رجحانات کی وجہ سے کسی قوم سے محبت کرتے ہیں اور کسی قوم سے بغض رکھتے ہیں، نہ تو اُنہیں ان کا معاملہ معلوم ہے اور نہ ہی ان کی دلیل، بلکہ وہ لوگ مطلقاً دوستی کرتے ہیں یا بغض رکھتے ہیں، اس بات کی پروا کیے بغیر کہ آیا وہ نبی ﷺ اور اُمت کے سلف سے صحیح طرح منقول ہیں یا نہیں اور نہ ہی اُنہیں اس بات کی پروا ہوتی ہے کہ وہ ان کے معنی و مفہوم کو سمجھیں یا ان کے نتیجے و تقاضے کو جانیں۔"[2]

کیا اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں سے محبت اور دوستی کو واجب قرار دیتے ہوئے نہیں فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝﴾ (المائدۃ:۵۶)

"اور جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور اہل ایمان کو اپنا رفیق بنالے، اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے۔"

ان لوگوں نے بت پرستوں کو تو چھوڑ دیا لیکن اہل ایمان سے لڑائی مول لی:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝﴾ (النور:۴۰)

"اور جسے اللہ نور نہ بخشے اس کے لیے پھر کوئی نور نہیں۔"

---

۱ صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب المساقاۃ و المعاملۃ بجزء من الثمر والزرع، حدیث نمبر ۴۰۴۴

۲ مجموع الفتاوی: ۵/۱۶۳

# امریکہ کا سفید جھوٹ اور عراق کی بربادی

## عالمی نشریاتی ادارے اور یورپی حکومتیں، امریکی جھوٹ کی تصدیق کرتے ہیں!!

ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

سید المرسلین نبی مکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«يُوشِكُ الْأُمَمُ أَنْ تَدَاعَى عَلَيْكُمْ كَمَا تَدَاعَى الْأَكَلَةُ إِلَى قَصْعَتِهَا». فَقَالَ قَائِلٌ: وَمِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ؟ قَالَ: «بَلْ أَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ كَثِيرٌ، وَلٰكِنَّكُمْ غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ! وَلَيَنْزَعَنَّ اللهُ مِنْ صُدُورِ عَدُوِّكُمُ الْمَهَابَةَ مِنْكُمْ، وَلَيَقْذِفَنَّ اللهُ فِي قُلُوبِكُمُ الْوَهْنَ»، فَقَالَ قَائِلٌ: يَا رَسُولَ اللهِ! وَمَا الْوَهْنُ؟ قَالَ: «حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ»[1]

"ایسا وقت آنے والا ہے کہ دوسری اُمتیں تمہارے خلاف ایک دوسرے کو بلائیں گی جیسے کہ کھانے والے اپنے پیالے پر ایک دوسرے کو بلاتے ہیں۔" تو کہنے والے نے کہا: کیا یہ ہماری ان دنوں قلت اور کمی کی وجہ سے ہو گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "نہیں، بلکہ تم ان دنوں بہت زیادہ ہو گے، لیکن جھاگ کی طرح ہو گے جس طرح کہ سیلاب کا جھاگ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کے سینوں سے تمہاری ہیبت نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں وَہْن ڈال دے گا۔" پوچھنے والے نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! وَہْن سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "دنیا کی محبت اور موت کو ناپسند کرنا۔" یعنی اپنے اپنے دنیوی مفادات کی فکر اور آخرت کو بھول جانا۔

انہی سالوں میں ملّتِ اسلامیہ پر کفر کی سب طاقتیں ٹوٹ پڑی ہیں، عراق وشام میں امریکہ اور فرانس کے بعد روس اور برطانیہ نے مسلمانوں کے خون سے بدترین ہولی کھیلنا شروع کر رکھی ہے۔ اسی سال ۲۰۱۷ء کے آغاز میں شام کے شہر حلب میں روسی افواج، سال کے وسط میں رِقّہ میں امریکی وبرطانوی فوجوں اور عراق میں موصل کی جنگ میں امریکی اَفواج نے بدترین بمباری اور قتل وغارت کے بعد مسلمانوں کے جان ومال اور عزت وحرمت پامال کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان کے ساتھ عراق وشام کی کٹھ پتلی ظالم حکومتوں کی سرکاری

---

1 سنن أبي داؤد: كِتَابُ الْمَلَاحِمِ (بَابٌ فِي تَدَاعِي الْأُمَمِ عَلَى الْإِسْلَامِ)

افواج، کردی و قبائلی طاقتیں اور ایران کی شیعہ افواج اور ملیشائیں زمینی پیش قدمی کرتی ہیں، جبکہ عالمی افواج ان کی تربیت، منصوبہ بندی اور بمباری کے ذریعے ان کا راستہ صاف کرتیں اور جیت کے نتائج کو سمیٹنے اور پھر ان میں مزید پھوٹ ڈالنے کے لئے آن موجود ہوتی ہیں۔

اسلامی تہذیب کے ان نمایاں شہروں کو تباہ و برباد، ان کی تاریخی مساجد اور تہذیبی مراکز کو کھنڈرات میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ان اسلامی شہروں میں عالمی قوتیں ایک طرف تباہی و ہلاکت کے پروانے بانٹتی ہیں تو دوسری طرف اقوامِ متحدہ اور صہیونیت کے عالمی امدادی ادارے انسانی حقوق کے نام پر ان شہروں کے باہر اپنے کیمپ لگا کر مسلمانوں کے زخموں پر نمک چھڑکنے کو جمع ہو جاتے ہیں۔ اپنے مفادات کی جنگ کو خانہ جنگی، دہشت گردی اور انتہاپسندی کے خلاف جنگ کا نام دے کر ہلاکت و تباہی کا جواز پیدا کر لیا جاتا ہے۔ فرانس اور برطانیہ میں آئے روز بڑھنے والی دہشت گردی اور فسادات کی وجہ انہی فوجی طاقتوں کا یہی وہ ظلم ہے جس کا ادنیٰ ردّعمل وہ اپنے معاشروں میں دیکھ رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہلاکت بانٹنے والے کبھی خود اپنے ضمیر اور ماحول میں پرامن نہیں رہ سکتے، یہ اللہ کی طرف سے بہت چھوٹا مکافاتِ عمل ہے اور ظالموں کا اصل بدلہ روزِ محشر ہو گا۔

اکیسویں صدی کے متمدن دور میں ہنستے بستے، جدید وسائل سے بھرپور شہروں کو تباہ و برباد کر کے کھنڈرات بنا دیا جاتا ہے، ان بدقسمت شہروں کے باسی جدید سوشل میڈیا پر آخری صدائیں دیتے ہیں کہ اس کے بعد ممکن ہے کہ یہاں سے کوئی اور فریاد بلند نہ ہو سکے۔ اس کی المناک تفصیل جاننے کے لئے شام کے سب سے زیادہ آبادی والے شہر حلب اور عراق کے دوسرے بڑے شہر موصل کی بربادی کا ایک نقشہ دیکھنا کافی ہو گا۔ ان شہروں کی بلند و بالا عمارتیں، متعدد منزلہ پلوں سے مزین شاہراہیں، زمینی وسائل سے مالا مال اور تہذیب و تمدن کے عین وسط میں موجود ہونا ان کے کوئی کام نہ آسکا۔ دنیا بھر کے میڈیا پر بمباری سے پہلے اور کامیابی کے بعد شہر کی صورتحال کی تقابلی تصاویر جابجا پیش کی جارہی ہیں جو اس ہلاکت کا ایک ادنیٰ منظر پیش کرتیں اور خون کے آنسو رلاتی ہیں کہ مسلمان بچوں، عورتوں اور مردوں کا خون کتنا ارزاں ہے۔ ان شہروں میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہے اور ہجرت یا متاثر ہو جانے والے تو شمار سے باہر ہیں۔ میڈیا پر ۲۰۰۳ سے تاحال جنگی نقصان کو شمار کرنے اور جائزے لینے والے دسیوں ادارے[1] موجود ہیں، ۲۰۱۱ء یعنی نام نہاد عرب سپرنگ سے پہلے تک کی ۸ سالہ جنگ ہی میں عالمی ادارے عراق میں ۸ لاکھ سے زیادہ ہلاکتوں کو رپورٹ کر رہے تھے، اس کے بعد تو شام کی جنگ، اور پھر داعش کے غلبے کے بعد اتحادی افواج کی بمباری کے نتیجے میں مرنے والے

---

1 برطانیہ کی سیرین آبزرویٹری فار ہیومن رائٹس SOHR...Casualties of the Iraq War...iraqbodycount

مسلمان ۲۵، ۳۰ لاکھ سے کیا کم ہوں گے اور اس جنگ نے دو ملکوں کے عوام کی زندگی تباہ و برباد کر دی، لاکھوں خاندان ہجرت کر گئے اور ہزاروں انسانی المیوں نے جنم لیا۔ مذکورہ عالمی ادارے اس تعداد کو بہت کم کر کے دکھاتے ہیں۔

یہ ظلم ایک دو اَقوام نے نہیں کیا بلکہ ۵۰ سے زیادہ ممالک کی اتحادی افواج کا کیا دھرا ہے، اور ان انسانی مظالم پر کوئی کفِ افسوس بھی نہیں ملتا اور اللہ کی گرفت سے بھی نہیں ڈرتا۔ کبھی اقوام متحدہ دہائی دیتی ہے کہ اتحادی افواج کا فلاں حملہ جنگی قوانین سے تجاوز اور کھلم کھلا نہتے افراد پر فائرنگ کا سبب ہے اور امریکی اس بربریت کو قبول بھی کر لیتے ہیں،[1] لیکن کون ہے جو اس ظلم کا ہاتھ روکے؟ کبھی شہریوں کو عمارت کے اندر رہنے کی تلقین کر کے، پوری عمارت اور جیتے جاگتے انسانوں پر بم گرا دیا جاتا ہے۔ صدام حکومت پر کیمیائی ہتھیاروں کا الزام لگانے والوں کو آج اقوام متحدہ دہائی دیتی ہے کہ وہ خود مَوصل میں کیمیائی اور ممنوع ہتھیار استعمال کر رہے ہیں[2] جس کے برے اثرات دہائیوں تک جائیں گے۔ جب تاریخی شہر ہی تباہ و برباد ہو گئے، ان کے باسی انسانوں کی حرمت نہ رہی تو وہاں کے تاریخی آثار کی حفاظت کیسی؟ یہی وجہ ہے کہ ان معروف شہروں میں صدیوں پرانے تاریخی آثار بھی بمباری کا نشانہ بن گئے اور اتحادی افواج اس کا الزام مقابل مزاحمت کرنے والوں پر دھر دیتے ہیں۔ مغرب سے مرعوب لوگ اہل مغرب کے جانوروں کے حقوق کا بہت ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، لیکن مغربی افواج مسلمانوں کو اپنے جانوروں جتنی اہمیت دینے کو بھی تیار نہیں ہیں۔

عراق وشام میں پانچ بڑی عسکری طاقتیں: امریکہ، روس، اسرائیل، ایران اور ترکی اپنے اپنے سٹریٹجک مفادات اور جنگ کے بعد کے فوائد میں حصہ پانے کے لئے اس کی چیر پھاڑ میں مصروف ہیں۔ روس کو بشار حکومت کی کمزوریوں کو ہاتھ میں کر کے مسلمانوں کے خون ومال کی بہتی گنگا سے ہاتھ دھونے ہیں تو امریکہ کو ایران سے فائدہ اُٹھا کر اس کو قابو میں بھی رکھنا ہے، ترکی کو کردوں کو کنٹرول کرنا ہے کہ وہ اس سے ملحقہ علاقے میں کردریاست بنانے میں ہی کامیاب نہ ہو جائیں، اور اسرائیل مسلمانوں کو اس قدر کمزور کرنا چاہتا ہے کہ وہ اس کی طرف منہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھ سکیں، آپس میں ہی الجھتے رہیں اور اس کو اپنے ساتھ ہی جاری جنگ سے کوئی گزند نہ پہنچے۔

کفر کی طاقتوں کی مدد کرنے والی کبھی بشار الاسد کی افواج ہوتی ہیں، اور کبھی عراقی فوج۔ شیعہ ملیشائیں، ایرانی پاسدارانِ انقلاب اور مفاد پرست کرد قبائل امریکہ کے حاشیہ نشین بن کر ہلاکتیں بانٹتے ہیں۔ ایک

1 http://www.bbc.com/urdu/world-39427448

2 http://www.dw.com/ur/a-۳۷۸۰۸۲۶۳

طرف امریکہ ۷ اپریل ۲۰۱۷ء کو شام کے عسکری مراکز پر ۵۹ کروز میزائل کے ذریعے باضابطہ جنگ اور تباہی وبربادی مسلط کرتا ہے تو دوسری طرف امریکہ کے اشاروں پر چلنے والے برطانیہ کی فوجیں رقہ میں بشار کی افواج کی قیادت کر رہی ہوتی ہیں۔ پھر یہی امریکہ بشار فوج کے ہمراہ، اکتوبر ۲۰۱۷ء میں رقہ کو بدترین بمباری سے صفحہ ہستی سے ہی مٹا دیتا ہے۔ روسی میجر جنرل ایگور کونسشی نوف کا کہنا تھا

"رقہ کو ڈریزڈن شہر کی [جنگ عظیم دوم] ۱۹۴۵ء والی قسمت ملی ہے جس کا امریکی بمباری سے صفایا ہو گیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسا لگتا ہے کہ مغرب کو اب رقہ میں مالی امداد پہنچانے کی بہت جلدی ہے کیونکہ وہ وہاں ہونے والے جرائم کی شہادتوں کو چھپانا چاہتے ہیں۔"[1]

ایک طرف امریکہ ایران کو دہشت گرد اور شیطانی طاقت کی دہائی دیتا ہے تو دوسری طرف موصل میں ایرانی پاسدارانِ انقلاب کی سپاہ اور اس کی تائید یافتہ شیعہ تنظیمیں امریکی قیادت میں پیش قدمی کر رہی ہوتی ہیں۔ عراق کے دوسرے بڑے شہر موصل میں کتنی ہلاکت ہوئی؟ بی بی سی کی زبانی:

"موصل کی جنگ کو دوسری جنگِ عظیم کے بعد شہری علاقے میں ہونے والی سب سے بڑی لڑائی سمجھا جا رہا ہے۔ لڑائی کے اختتامی ہفتوں میں پانچ ہزار سے زیادہ مقامات تباہ ہوئے۔ ان میں سے ۹۸ فیصد رہائشی عمارتیں تھیں جو زیادہ تر شہر کے قدیمی علاقے میں واقع تھیں۔ لڑائی کے دوران ۱۳۰ کلومیٹر طوالت کی سڑکیں بھی تباہ ہوئیں جن میں سے ۱۰۰ کلومیٹر سڑکیں مغربی موصل کی تھیں۔ اتحادی افواج کے طیاروں کی بمباری سے دریائے دجلہ پر بنائے گئے وہ پانچوں پل بھی تباہ ہو گئے جو شہر کے مشرقی اور مغربی علاقوں کو ملاتے تھے۔ شہر کا ہوائی اڈہ، ریلوے سٹیشن اور ہسپتالوں کی عمارتیں بھی کھنڈرات کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔ عراقی حکومت کے اندازوں کے مطابق موصل میں صحتِ عامہ کی ۸۰ فیصد سہولیات تباہ ہو چکی ہیں۔ موصل عراقی صوبے نینوا میں صحت کی سہولیات کا سب سے بڑا مرکز تھا۔"[2]

اتحادی ظالم اپنے منافقانہ حملوں اور چالبازانہ ہتھکنڈوں کے ذریعے دنیا کو دھوکہ دیتے ہیں، دراصل کفر سارے کا سارا ایک ہی ملت ہے، اور اس کے اعوان وانصار کا انجام بھی ان کے ساتھ ہی ہے۔ افسوس کہ صہیونی میڈیا اوّل تو ہلاکتوں کی یہ خبریں نشر نہیں کرتا، اور اگر نشر کر بھی دے تو اس میں حقائق اور خیر وشر کی قوتوں کا اس قدر مسخ شدہ اور خلافِ حقیقت تذکرہ ہوتا ہے کہ انتشار اور مغالطوں کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

---

1 http://www.bbc.com/urdu/world-41716563

2 http://www.bbc.com/urdu/world-40925721, dated 15/8/17

## عراق کی جنگ کی حقیقت

آج عراق میں بغداد حکومت کی فتح وکامرانی کی بات ہوتی ہے، اور ہمارا مغرب نواز میڈیا ۱۴ سال بعد فتح کامل اور امن وسکون کی نوید سناتا ہے۔ یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ امریکہ وبرطانیہ کی قیادت میں اتحادی افواج، جس نے صدام حسین کے عراق پر تباہ کن یلغار کی، ان دونوں ممالک کے اپنے تحقیقی ادارے عراق پر اس جارحیت کو سراسر ظلم قرار دیتے ہیں۔ امریکہ نے جن کیمیائی ہتھیاروں کی بنا پر عراق کے خلاف فوجی اقدام کیا تھا، دنیا بھر میں یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ کیمیائی ہتھیاروں کا یہ بہانہ سراسر جھوٹ اور عالمی سازش تھی، اور صدر بش نے جھوٹ بول کر اپنے مادی مفادات اور مشرقِ وسطی کو جنگ میں جھونکنے کے لئے عراق پر عسکری جارحیت کر کے اس کو تباہ وبرباد کیا۔ آج یہ فتح اس ظلم ودرندگی کی تکمیل کی خوشی میں ہے جس کے ہر ہر قدم سے دہشت وبربریت ٹپک رہی ہے اور اس کا سارا انحصار جھوٹ اور منافقت پر ہے۔

عراق پر مارچ ۲۰۰۳ء میں ہونے والی اس امریکی یلغار کی اصل تائید برطانیہ نے کی، لیکن دونوں ممالک کی پارلیمنٹوں کے اندر اس کے خلاف شدید مزاحمت ہوئی۔ آخر کار برطانوی پارلیمنٹ کو اپنے وزیر اعظم ٹونی بلیئر کے اس اقدام کی تفتیش کے لئے ۲۰۰۸ء میں ایک کمیشن قائم کرنے میں کامیابی ملی جس کی رپورٹ سات برس کی مسلسل تحقیق اور تاخیری حربوں سے نمٹنے کے بعد جولائی ۲۰۱۶ء کو اس نتیجے کے ساتھ سامنے آئی کہ "برطانیہ کی عراق پر یلغار میں امریکہ کا ساتھ دینا سراسر زیادتی اور ظلم" ہے:

① ۲۶ لاکھ الفاظ پر مشتمل، اور دس لاکھ پاؤنڈ کے اخراجات کے نتیجے میں تیار ہونے والی برطانیہ کی سرکاری انکوائری کمیشن کے چیئرمین سر جان چلکوٹ Chilkot نے یہ قرار دیا کہ

"عراق کے وسیع پیمانے پر تباہی والے ہتھیاروں سے درپیش خطرات کی سنجیدگی کے بارے میں رائے کو جس یقین کے ساتھ پیش کیا گیا تھا، اسے ثابت نہیں کیا جاسکا۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جن حالات کی بنا پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ برطانوی فوجی کارروائی کے لیے قانونی جواز موجود ہے، وہ کہیں سے اطمینان بخش نہیں تھے۔ جمع کی گئی خفیہ معلومات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عراق کیمیائی اور بائیولوجیکل ہتھیار بنانے یا جوہری ہتھیار بنانے کی کوشش جاری رکھے ہوئے تھا۔

جنگ کے قانونی جواز پر کوئی بحث نہیں کی گئی اور برطانیہ نے اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کے اختیارات کی اہمیت کو کم کیا۔

ٹونی بلیئر نے صدر بش کو لکھا کہ "جو کچھ بھی ہو ہم آپ کے ساتھ ہیں۔"[1]

---

1 بی بی سی، اردو ۶ جولائی ۲۰۱۶ء... اور ۲۹ مئی ۲۰۱۴ء

یاد رہے کہ اس کمیشن کے سامنے دوبار برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر اور سو سے زیادہ گواہوں کو بیانات کے لئے طلب کیا گیا اور امریکی صدر جارج بش اور برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر کی گفتگو کی ۱۳۰ ریکارڈنگز کو بھی سامنے رکھا گیا، جن کے اصل متن کو دونوں ممالک کے تعلقات متاثر ہونے کے خدشے کے پیش نظر ۳۰ برس سے پہلے شائع نہیں کیا جائے گا۔

برطانیہ کے اس ناجائز اقدام کی مذمت، اپریل ۲۰۰۳ء میں صدام حکومت پر جارحیت کے وقت برطانوی نائب وزیر اعظم جان پریسکوٹ نے بھی کی، بی بی سی کو انٹرویو میں آپ کہتے ہیں:

"برطانیہ اور امریکہ کا عراق پر حملہ غیر قانونی تھا۔" برطانوی اخبار 'سنڈے مرر' میں اُنھوں نے لکھا کہ "انھیں تاحیات اس تباہ کن فیصلے کے ساتھ زندگی بسر کرنی ہوگی۔"

لارڈ پریسکوٹ نے کہا کہ وہ اب 'انتہائی غم وغصے' کی حالت میں اقوامِ متحدہ کے سابق سیکریٹری جنرل کوفی عنان سے متفق ہیں کہ "یہ جنگ غیر قانونی تھی۔"

انھوں نے لیبر پارٹی کے جیرمی کوربن کی اپنی پارٹی کی جانب سے معافی مانگنے پر تعریف کی۔

لارڈ پریسکوٹ نے یہ بھی لکھا کہ مارچ میں حملے سے قبل امریکی صدر جارج ولیم بش کے نام برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر کا پیغام کہ "چاہے کچھ بھی ہو، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔" تباہ کن تھا۔

"کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب ہم جنگ میں جانے کے فیصلے کے بارے میں نہیں سوچتے۔ ان برطانوی فوجیوں کے بارے میں جنھوں نے اپنی زندگی دی اور اپنے ملک کے لیے زخم اُٹھائے۔ ان پونے دو لاکھ لوگوں کی موت کے بارے میں جو صدام حسین کو ہٹانے اور ہمارے پینڈورا باکس کھولنے کے نتیجے میں واقع ہوئیں۔"[1]

② ہالینڈ کے اسی مسئلے پر قومی تحقیقاتی کمیشن کی رائے بھی اس سے مختلف نہیں، بلکہ یہ کمیشن تو ہالینڈ کے اپنی افواج بھیجنے کو اقوامِ متحدہ کی قراردادوں سے تجاوز بھی قرار دیتا ہے۔ جنوری ۲۰۱۰ء میں ڈوئچے ویلے نامی مستند جرمن نیوز ایجنسی میں چھپنے والی رپورٹ بتاتی ہے کہ

"بین الاقوامی قانون کے تحت ۲۰۰۳ء میں عراق پر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے حملے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ ڈچ آزاد کمیشن کو امریکی سربراہی میں لڑی جانے والی عراق جنگ میں ہالینڈ کے کردار کی

---

http://www.bbc.com/urdu/world/۱۶۰۷۰۶/۰۷/۲۰۱۶_salient_point_chilcot_fz

۱ بی بی سی، اردو، ۱۰ جولائی ۲۰۱۶ء...

http://www.bbc.com/urdu/world/۱۶۰۷۱۰/۰۷/۲۰۱۶_iraq_war_illegal_deputy-pm_mb

چھان بین کا کام سونپا گیا تھا۔ اس تحقیقاتی پینل کے مطابق 'دی ہیگ' نے عراق حملے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔

تحقیقاتی کمیشن کے چیئرمین ولی برورڈ ڈیوڈز نے دی ہیگ میں صحافیوں کو بتایا کہ بین الاقوامی قوانین عراق جنگ کے لئے کوئی بنیاد فراہم نہیں کرتے تھے تاہم ان کے مطابق ہالینڈ حکومت نے "اس غیر مقبول جنگ کی عسکری نہیں بلکہ سیاسی حمایت کی۔" کمیشن کے مطابق ٹھوس بنیاد کی عدم موجودگی کے باوجود جارج بُش کے جنگ کے فیصلے کی حمایت کی گئی۔

کمیشن کے چیئرمین نے مزید بتایا کہ منطقی طور پر اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر ۱۴۴۱ کے الفاظ کی تشریح اُس طرح سے نہیں ہو سکتی ہے جس طرح عراق میں امریکی فوجی مداخلت کے وقت ہالینڈ حکومت نے کی۔ "اقوام متحدہ کی قرارداد ۱۴۴۱ کی تشریح یہ نہیں ہے کہ سلامتی کونسل کے چند رکن ممالک کونسل کی قراردادوں کے اطلاق کے لئے کسی دوسرے ملک کے خلاف فوجی کارروائی کریں۔"

سلامتی کونسل نے ۲۰۰۲ء میں یہ قرارداد منظور کرتے ہوئے عراق کو 'تخفیفِ اسلحہ کے ضوابط پورے کرنے کا آخری موقع' فراہم کیا تھا۔"[1]

③ خود جارج بش نے جب اپریل ۲۰۰۳ء میں عراق پر فوج کشی کا آغاز کیا تو اس پر امریکی کانگرس میں شدید تنقید ہوئی اور جارج بش کو جھوٹ در جھوٹ کا مرتکب قرار دیا گیا... ۲۰۰۳ء میں بی بی سی کی رپورٹ:

"بی بی سی کو پتہ چلا ہے کہ سی آئی اے نے امریکی صدر جارج بُش کی طرف سے عراق کے ایٹمی عزائم کو جنگ کا جواز بنانے سے پہلے حکومت کو خبردار کیا تھا کہ یہ دعوے غلط ہیں۔ سی آئی اے نے بی بی سی کو بتایا ہے کہ عراق کی نائجر سے یورینیم خریدنے کی کوشش کی اطلاعات کے غلط ہونے کے بارے میں شک کا اظہار صدر جارج بُش کے کانگرس سے اہم خطاب سے کم از کم دس ماہ پہلے کر دیا گیا تھا۔

منگل کے روز وائٹ ہاؤس نے پہلی بار باضابطہ طور پر اعتراف کیا کہ عراق کی نائجر سے یورینیم خریدنے کے بارے میں اطلاع غلط ثابت ہوئی تھی اور صدر کے کانگرس سے خطاب میں اس کا ذکر نہیں ہونا چاہیے تھا۔ تاہم سی آئی اے کی فراہم کردہ معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ امریکی انتظامیہ کو صدر بش کی تقریر سے بہت پہلے، نہ کہ صدر بُش کے خطاب کے بعد پتہ چلا تھا کہ عراق کے بارے میں یورینیم کی خرید کا دعویٰ غلط ہے۔ سی آئی اے کا کہنا ہے کہ ایک سابق امریکی سفیر نے مارچ ۲۰۰۲ء میں عراق کے بارے میں اس خبر کو غلط قرار دیا تھا اور یہ بات صدر بُش کے خطاب سے بہت پہلے وائٹ ہاؤس

1 http://www.dw.com/ur/..../a-۵۱۱۵۳۶۷

سمیت مختلف سرکاری محکموں کو بتادی گئی تھی۔ایک سابق امریکی سفیر جوزف ولسن بیان دے چکے ہیں کہ وہ عراق کے خلاف الزامات کی تحقیق کرنے افریقہ گئے تھے اور انہیں اس بابت کوئی ثبوت نہیں ملا۔برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر اور امریکی صدر جارج بش دونوں نے عراق کی طرف سے نائجر سے یورینیم خریدنے کا ذکر کیا تھا لیکن جن دستاویزات کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا گیا وہ جعلی ثابت ہوئیں۔
برطانوی وزیر اعظم کو برطانوی ارکان پارلیمان کی طرف سے عراق کے خلاف جنگ کے حق میں تیار کی جانے والی دستاویزات کے حقیقت پر مبنی ہونے کے بارے میں سوالات کا سامنا ہے۔امریکہ میں بھی اس بارے میں بتدریج سوالات اٹھائے جارہے ہیں۔
جارج بُش نے جنگ سے پہلے کانگرس میں اپنے خطاب میں کہا تھا کہ
"برطانوی حکومت کو پتہ چلا ہے کہ صدام حسین نے حال ہی میں افریقہ سے بڑی مقدار میں یورینیم حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔"[1]

مذکورہ بالا خبریں مستند برطانوی اور جرمنی نیوز ایجنسیوں: بی بی سی اور ڈوئچے ویلے کی خبروں کے اصل اقتباسات پر مبنی ہیں جن سے واضح معلوم ہوتا ہے کہ صدر بش نے عراق پر حملہ کرتے ہوئے جن جھوٹے الزامات کا سہارا لیا، اس پر امریکی سی آئی اے پہلے ہی اعتراضات عائد کرچکی تھی، جب صدر بش سے کچھ جواب بن نہ پڑا تو انہوں نے ٹونی بلیئر کی برطانوی حکومت کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا کہ ان کے پاس نائجر سے عراق کے کیمیائی ہتھیاروں کی خریداری کے ثبوت موجود ہیں۔لیکن اس بات کو تسلیم نہ کرتے ہوئے نائجر حکومت نے برطانوی حکومت پر مقدمہ کردیا، اور یونان میں وکلا کی ایک تنظیم نے بھی اس سلسلے میں عالمی عدالت انصاف میں کیس دائر کیا:

"بی بی سی کی رپورٹ... بلیئر پر امریکہ کی بے لاگ تقلید کا الزام لگایا جاتا ہے۔یونان میں وکلا کا ایک گروپ سوموار کو ہیگ میں قائم جرائم کی عالمی عدالت میں برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر اور ان کی حکومت کے خلاف عالمی قوانین کی خلاف ورزی کا مقدمہ دائر کررہا ہے۔ان وکلا کا کہنا ہے کہ برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر، ان کی حکومت اور دوسرے اعلیٰ حکام نے عراق پر حملے میں عالمی قوانین کی خلاف ورزی کی ہے۔وکلا کے مطابق عراق پر حملے کے لیے جن قوانین کی خلاف ورزی کی گئی ہے ان میں اقوام متحدہ کا منشور، حقوق انسانی کا جنیوا کنونشن اور ہیگ کی عالمی عدالت کے قوانین شامل ہیں۔
دوسری طرف خود برطانیہ میں بھی یہی تنازعہ چل رہا ہے اور کہا جارہا ہے کہ حکومت نے عراق پر حملے

1 http://www.bbc.com/urdu/news/۰۳۰۷۰۹_bush_cia.shtml

کے لیے جو الزامات عائد کئے تھے، ان میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا تھا۔
ادھر نائجر کے وزیر اعظم نے بھی مطالبہ کیا ہے کہ برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر اس بات کے ثبوت مہیا کریں کہ نائجر نے عراق کو یورینیم فروخت کرنے کی کوشش کی تھی۔ امریکہ نے بھی یہ الزام لگایا تھا کہ عراق کے معزول صدر صدام نے ایٹمی ہتھیار بنانے کے لیے نائجر سے یورینیم خریدنے کی کوشش کی تھی تاہم بعد میں اس الزام کو جعلی دستاویزات پر مبنی قرار دے دیا تھا۔ جبکہ برطانیہ مصر تھا کہ اس کے پاس اس بات کے اپنے ثبوت ہیں۔"[1]

④ عراق پر ناجائز حملہ کا معاملہ اس قدر واضح ہے کہ اپنی افواج کے اس حملہ میں شرکت کرنے پر آسٹریلیا کے وزیر اعظم جان ہاورڈ نے باضابطہ معافی مانگی۔ ۱۲ر جولائی ۲۰۰۳ء کو بی بی سی کی رپورٹ کے الفاظ یہ ہیں:
"آسٹریلیا کے وزیر اعظم جان ہاورڈ نے عراق پر جنگ کے دوران غلط خفیہ رپورٹوں کی بنیاد پر امریکی سالاری میں آسٹریلوی دستوں کی شمولیت کو جائز قرار دینے پر معافی مانگی ہے۔
ہاورڈ نے پارلیمان سے خطاب کے دوران عراق کے لیے فوج روانہ کرنے کے لیے ان دعووں کا حوالہ دیا تھا جن میں کہا گیا تھا کہ عراق نے ایک افریقی ملک نائجر سے یورینیم خریدنے کی کوشش کی ہے۔
تاہم عراق پر عائد کردہ یہ تمام الزامات اب غلط ثابت ہو چکے ہیں۔
دراصل ہاورڈ کو خفیہ امور سے براہِ راست مطلع کرنے والا نیشنل اسیس منٹس کا دفتر پہلے ہی آگاہ تھا کہ عراق سے متعلق موصول شدہ اطلاعات شکوک پر مبنی ہیں لیکن یہ دفتر وزیر اعظم ہاورڈ کو اس بات سے باخبر رکھنے میں ناکام رہا تھا۔ نیشنل اسیس منٹس کے دفتر کے علاوہ دیگر جاسوس ایجنسیاں بھی حکام کو اس بات سے باخبر نہیں رکھ سکیں۔
جان ہاورڈ نے ملکی پارلیمان کو گمراہ کرنے پر معافی طلب کی اور کہا کہ انہوں نے دانستہ طور پر پارلیمان سے غلط بیانی نہیں کی تھی۔ تاہم یہ بات انتہائی شرمناک ہے کہ کئی ماہ سے آسٹریلوی خفیہ ایجنسیوں کے علم میں ہونے کے باوجود وزیر اعظم ہاورڈ کو اس بات سے آگاہ نہیں کیا گیا کہ عراق سے متعلق افریقی یورینیم حاصل کرنے کے دعوے مشکوک تھے۔"

⑤ عراق میں بڑے پیمانے پر تباہی پھیلا سکنے والے ہتھیاروں کا سراغ لگانے پر مامور اقوام متحدہ کے معائنہ کاروں کے سربراہ ہانس بلکس اور عالمی ادارہ برائے جوہری توانائی کے سربراہ محمد البرادعی کا عراق کے

---

۱ بی بی سی، اردو: ۲۸ جولائی ۲۰۰۳ء...
http://www.bbc.com/urdu/news/۰۳۰۷۲۸_blaircase_sen.shtml

بارے میں موقف ملاحظہ کریں۔ ہانس کے ساتھ امریکی حکومت نے کیسا بدترین سلوک روا رکھا، اس کی تفصیل بی بی سی کی اس رپورٹ میں ہے:

"اقوام متحدہ کے اسلحہ کے معائنہ کاروں کے سربراہ ہانس بلکس نے امریکی وزارتِ دفاع کے کچھ عناصر پر الزام عائد کیا ہے کہ وہ 'حرامزادے' ان کی تین سالہ سربراہی کے پورے دور میں ان کی جڑیں کاٹتے رہے۔

نیویارک میں واقع اقوام متحدہ کی اکتیس منزلہ عمارت میں اپنے دفتر میں برطانوی اخبار دی گارڈین کو ایک خصوصی انٹرویو دیتے ہوئے ہانس بلکس اتنے بپھرے ہوئے تھے کہ اپنے اعلیٰ عہدے کے لحاظ سے سفارتی آداب کی نفی کرتے ہوئے انہوں نے شدید غصّہ کی حالت میں واشنگٹن اور عراق دونوں جگہ موجود اپنے مخالفین کا تذکرہ گالم گلوچ سے کیا۔

ہانس بلکس نے الزام عائد کیا کہ 'واشنگٹن میں مجھ سے حسد کرنے والے موجود ہیں جنہوں نے ساری گڑبڑ پھیلائی۔ یقیناً اُنہوں نے ہی ذرائع ابلاغ میں گھٹیا خبریں چھپوائیں۔ ہانس بلکس نے مزید الزامات عائد کرتے ہوئے کہا کہ بش انتظامیہ ان کے معائنہ کاروں پر دباؤ ڈالتی رہی کہ وہ اپنی رپورٹوں میں مزید پھٹکارے جانے والی زبان استعمال کریں۔

گزشتہ نومبر میں جب وہ چار سال کے وقفے کے بعد ایک بار پھر نئے سرے سے حساس ہتھیاروں کے معائنے کے لئے عراق پہنچے تو بھی امریکی محکمۂ دفاع کے عناصر یہ کہہ کہہ کر اس کام کے لئے عمر گزار دینے والے ماہر کی چمڑی ادھیڑتے رہے کہ وہ اس کام کے لئے بدترین انتخاب ہیں۔

ممکن تھا کہ عراقی حکومت ہتھیاروں سے متعلق اقوام متحدہ کی کسی قرارداد پر عمل درآمد کرتی لیکن ایسا صرف اس لئے ہوا کہ علاقے میں دو لاکھ امریکی فوج موجود تھی۔ لیکن جیسے جیسے عراق پر امریکی حملے کا وقت قریب آیا، ان کے معائنہ کاروں پر عراق کے خلاف سخت زبان استعمال کرنے کے لئے دباؤ پڑنا شروع ہو گیا۔"[1]

⑥ عراق پر امریکی جارحیت عالمی قوانین کی خلاف ورزی ہے: ہانس بلکس

"اقوام متحدہ کے سابق اسلحہ انسپکٹر ہانس بلکس نے زور دے کر کہا ہے کہ عراق پر امریکہ کا حملہ غیر قانونی اور عالمی قوانین کی خلاف ورزی تھی۔ ہانس بلکس نے صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ دنیا کے اکثر ماہرین قانون کا کہنا ہے کہ عراق پر امریکہ کا حملہ اقوام متحدہ کے منشور کی خلاف ورزی تھی۔ اقوام

1 http://www.bbc.com/urdu/news/۰۳۰۶۱۱_blix_pentagon_si.shtml

متحدہ کے منشور میں رکن ممالک کو اپنے خلاف ہونے والی جارحیت کے مقابلے کی اجازت دی گئی ہے لیکن برطانیہ اور امریکہ کو صدام کی جانب سے حملے کا خطرہ درپیش نہیں تھا۔ ہانس بلکس نے اس بات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل بھی عراق پر امریکہ اور برطانیہ کے حملے کے خلاف تھی، اور کہا عراق پر حملے کا کوئی قانونی جواز نہیں تھا۔" ہانس، محمد البرادعی سے پہلے ایٹمی توانائی کی عالمی ایجنسی کے سولہ سال تک سربراہ رہ چکے ہیں، اس لئے وہ عراق کے فوجی ہتھیاروں کے معاملے سے آگاہ تھے۔ وہ صراحت کے ساتھ کہتے ہیں کہ عراق میں عام تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی موجودگی ایک ہتھکنڈہ تھا جس کو امریکہ اور برطانیہ نے عراق کے خلاف جارحیت کے سلسلے میں رائے عامہ کو دھوکہ دینے کے لئے استعمال کیا۔ ہانس بلکس نے یہ بھی کہا ہے کہ عراق میں القاعدہ کے جنگجو نہیں تھے بلکہ عراق پر امریکی حملے کے بعد القاعدہ اور بعض دوسرے دہشت گرد گروہ عراق میں داخل ہوئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عراق پر امریکی حکومت کے حملے کے بعد دہشت گردی کو فروغ ملا۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ نے عراق کی توانائی کے ذخائر اور تیل تک رسائی کے پیش نظر عراق پر حملہ کیا۔ اب عراق پر امریکی حملے کے خفیہ مقاصد پہلے سے زیادہ کھل کر سامنے آچکے ہیں۔ اور عالمی رائے عامہ امریکی صدر جارج بش پر جھوٹ بولنے اور دہشت گردی کے خطرے کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا الزام لگا رہی ہے۔ عالمی رائے عامہ کا خیال یہ ہے کہ بش پر عراق میں جنگی جرائم انجام دینے کے الزام میں مقدمہ چلایا جانا چاہئے۔"[1]

⑦ عراق پر جارحیت اور قبضے کی وجوہات میں اہم چیز دراصل عراق کے تیل کی دولت ہے۔ عراق میں ۱۹۷۰ء کے جائزے کے مطابق سعودی عرب اور ایران کے بعد سب سے زیادہ تیل کے ذخائر پائے جاتے ہیں، لیکن ۲۰۰۳ء سے پہلے کے ۱۵ سالوں میں عراقی تیل کی اوسط یومیہ پیداوار ایک لاکھ بیرل سے نہیں بڑھ سکی جبکہ عراق پر امریکی قبضہ کے بعد چھ لاکھ بیرل یومیہ سے تجاوز کر چکی ہے، اور سعودی عرب کی ۸ لاکھ بیرل اوسط یومیہ پیداوار ہے۔ جب عراق پر امریکی قبضہ ہے تو اس کے فیصلے اور تیل آمدن سے بھی اصل قابض کو ہی مالی فوائد حاصل ہوتے ہیں اور بعید نہیں کہ 'امریکی شیل' دراصل عرقی تیل ہی ہو۔ اب بھی (نومبر ۲۰۱۷ء) کٹھ پتلی عراقی حکومت کے پیش نظر تباہ ہونے والے شہروں کی بحالی کا کوئی پلان اور منصوبہ نہیں، نہ اس کے لئے کوئی رقم مختص کی گئی ہے۔ امریکی اتحاد اور عراقی حکومت نے جنگ کے بعد تباہ ہونے والے شہروں کی بحالی کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جس کا آج تک کوئی اجلاس نہیں ہو سکا۔

1 http://urduold.ws.irib.ir/

عراقی سابقہ وزیر خارجہ اور سابق وزیر خزانہ حسین زیباری اس حوالے سے عراقی وزیر اعظم حیدر العبادی پر شدید تنقید کرتے ہیں کہ وہ فوجی آپریشن تک اس اہم انسانی مسئلے کو مسلسل نظر انداز کر رہے ہیں۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ عراقی حکومت کی ترجیحات کا فیصلہ امریکہ سے کیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا رپورٹس مغربی اداروں کی ویب سائٹس پر آج بھی موجود ہیں، جو امریکی ظلم کا کھلا ثبوت ہیں۔ ان سے علم ہوتا ہے کہ امریکہ نے مشرق وسطیٰ میں موجود دو لاکھ فوجیوں کے ذریعے جنگ شروع کرنے کے لئے کیمیائی ہتھیاروں کا جو جواز تراشا تھا، اس پر سب سے پہلے امریکی سی آئی اے اور امریکی کانگرس میں آواز اُٹھی۔ اس وقت کی امریکی وزیر خارجہ کونڈالیزا رائس نے خود یہاں تک اعتراف کیا کہ جارج جونیئر بش کی بات تو غلط ہے تاہم یہ عمداً جھوٹ نہیں بلکہ ان کو غلطی لگی ہے۔ امریکہ نے یہ عذرِ لنگ تراشا کہ امریکی سی آئی اے کو ان الزامات کے غلط ہونے کا علم تھا اور ان کے غلط ہونے کی تحقیق تو امریکی ادارے کر چکے تھے، لیکن یہ بات جارج بش کے علم میں نہ آسکی۔ یہی جواز آسٹریلیا کے وزیر اعظم نے بھی پیش کیا کہ آسٹریلین اداروں کو علم ہونے کے باوجود اُنہیں اس کی خبر نہ ہو سکی۔ پھر اپنے جھوٹے موقف کو جواز دینے کے لئے امریکہ نے برطانیہ کے وزیر اعظم ٹونی بلیئر کی ناجائز تائید کو استعمال کیا، جنہوں نے نائجر سے کیمیائی ہتھیاروں (یورینیم کی خرید) کی آمد کا الزام لگایا، لیکن ایک طرف اس الزام کو نائجر حکومت نے چیلنج کر دیا تو دوسری طرف عالمی ادارہ انصاف میں اس جرم کے خلاف شکایت بھی دائر کی گئی۔ اس دوران امریکہ اقوام متحدہ کے ہتھیاروں کے نگرانوں کو بھی دھمکاتا رہا، اور اقوام متحدہ کی قرار دادوں کا بھی اس نے استحصال کیا۔ مزید برآں امریکہ کے اس غلط اقدام کو ہالینڈ کے قومی کمیشن اور آسٹریلیا کے وزیر اعظم نے ناجائز قرار دیتے ہوئے اپنی قوموں سے معافی مانگی۔ اب جب سارا انحصار برطانوی وزیر اعظم بلیئر پر تھا تو ۲۰۰۹ء میں شدید اصرار کے بعد برطانوی پارلیمنٹ نے تحقیقاتی کمیشن بنوانے میں کامیابی حاصل کی تو اس کی رپورٹ پر تاخیری حربے استعمال کئے گئے، آخر کار ایک سال قبل برطانیہ نے بھی ٹونی بلیئر کی زیادتی، غیر قانونی اقدام اور ناکافی ثبوتوں کا اعتراف کر لیا۔ اس ساری صورتحال میں کبھی ایسی خبریں بھی آئیں کہ امریکی فوجیوں کو کیمیائی ہتھیار تو ملے ہیں لیکن انہوں نے کسی کو دکھانے سے قبل خود ہی ضائع کر دیے۔ تاہم اس طرح کے الزامات اور دعوؤں کو کسی نے قبول نہ کیا، جس کی تصدیق مختلف ممالک کی باضابطہ رپورٹس آج بھی کرتی ہیں۔ میڈیا، تہذیب وتمدن اور انسانی حقوق کے اس 'روشن دور' میں بھی عراقی مسلمانوں پر ہونے والا یہ ایسا سنگین ظلم ہے جس کی مثال چنگیز وہلاکو کے دور سے بھی پیش نہیں کی جاسکتی۔ یہ ہے انصاف، امن اور انسانی حقوق کے مغربی نعروں کی حقیقت!!

مارچ سے مئی ۲۰۰۳ء کے دوران ساٹھ دنوں تک جاری رہنے والی جنگ میں آخر امریکہ نے عراق پر غاصبانہ تسلط جمالیا، اور اس کے بعد امریکی غاصب فوج وہاں دو سال تک خود قابض رہی، پھر اسی فوج نے دسمبر

۲۰۰۶ء میں صدام حسین کو عید الاضحیٰ کی صبح تختہ دار پر لٹکا دیا، اس کے بعد امریکیوں نے پہلے خود اور پھر شیعہ حکام کی کٹھ پتلی حکومتیں قائم کر دیں جو آج تک مختلف صورتوں میں چلی آ رہی ہیں۔ ان کے مقابلے میں جو قوتیں منظم ہوئیں، (جن کی اصل حقیقت اللہ ہی جانتا ہے) آج عالمی میڈیا ان کو دہشت گرد کہتے ہوئے نہیں تھکتا اور یہی غاصب امریکی حکومت جب اپنی کٹھ پتلیوں کے ذریعے عراقی شہروں پر اپنی حکومت کو مستحکم کرتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ باغی جو دراصل عراق کے مظلوم شہری اور مزاحمت کار ہیں، کو شکست دے دی گئی ہے۔

⑧ جب عراق پر امریکہ کا سارا حملہ ہی سرے سے ناجائز ہے، اور امریکہ سمیت برطانیہ، ہالینڈ اور آسٹریلیا اس پر اپنی اپنی پارلیمنٹ سے معافی مانگتے رہے ہیں، تو اس کے نتیجے میں بننے والی امریکی حکومت... جس کی قیادت کی ذمہ داری 'دہشت گردی کے امریکی ماہر' جان پریمر کو سونپی گئی تھی... ہی ناجائز اور ظلم در ظلم کی داستان ہے۔ لیکن افسوس کہ 'مہذب مغربی دنیا' میں انصاف کی نہیں، طاقت اور لاٹھی کی حکومت ہے، اور اسلام و مسلمانوں کا اس دنیا میں کوئی سہارا نہیں۔ بی بی سی کے سیکولر نامہ نگار وسعت اللہ خاں نے مئی ۲۰۰۳ء میں عراق کا دورہ کیا تھا، وہ اپنے دورہ کی یادداشتوں میں لکھتے ہیں:

"پال پریمر کے آرڈر نمبر ۲ سے القاعدہ اور داعش نے جنم لیا: آج ٹھیک تیرہ برس بعد جب میں اپنی عراقی یادیں کھنگال رہا ہوں تو یوں لگ رہا ہے کہ صدام حسین لاکھ برا سہی مگر اس کے بوٹوں نے عراقی فالٹ لائنز کو دبا کے رکھا ہوا تھا اور ملک میں ایک جبری امن قائم تھا۔ قابض طاقتوں نے صدام دور کے کلیدی ادارے یک لخت تحلیل کر کے گویا اس دیگ کا ڈھکن اُڑا دیا جس میں نسلی، علاقائی و مذہبی تضادات کا تیزاب اُبل رہا تھا۔ گویا پال بریمر کا فرمان نمبر ۲ شاید عراق میں القاعدہ اور پھر القاعدہ کے بطن سے داعش کی پیدائش کا اعلان تھا۔"[1]

یہاں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ ۲۰۰۳ء میں امریکہ کی عراقی جارحیت کے وقت سعودی عرب امریکی اتحاد (جس میں برطانیہ، آسٹریلیا اور ہالینڈ وغیرہ شامل تھے) کا حصہ نہیں تھا، بلکہ سعودی عرب جو ماضی کی عراق ایران جنگ میں عراق کا قریبی حلیف اور بعد میں جنگ خلیج میں صدام کی جارحیت کا نشانہ بنا، اس کا موقف یہی تھا کہ صدام حسین کی حکومت کا خاتمہ عراق و شام کو ایک نہ ختم ہونے والی خانہ جنگی کا شکار کر دے گا۔ اس لئے امریکہ کو یہ ظلم نہیں کرنا چاہیے۔

عراق میں امریکی جنگ کی حقیقت کے تناظر میں مسلم حکمرانوں کے لئے سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ

---

۱ بی بی سی اردو... ۶ جولائی ۲۰۱۶ء... وہ ایک فرمان جس نے داعش کو جنم دیا!!
http://www.bbc.com/urdu/world/۱۶۰۷۰۵/۰۷/۲۰۱۶_iraq_special_feature_part۲_rh

امریکہ اپنے دوست / ایجنٹ حکمرانوں کے ساتھ کیا سلوک رکھتا ہے، یہ امریکی سفیر اپریل گلیسپی April Glapsie ہی تھی جس نے صدام حسین کو یقین دلایا تھا کہ اگر وہ کویت پر حملہ کر دے تو امریکہ کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ اور یہ صدام حسین ہی تھا جس نے مشرق وسطیٰ میں پہلے ایران اور پھر کویت سے جنگ کا آغاز کر کے، عالم عرب میں سب سے پہلی خانہ جنگی کا آغاز کیا۔ آج مشرق وسطیٰ میں ہونے والی ساری قتل وغارت صدام حسین کی ہٹ دھرمی اور مسلم امہ سے کی جانے والی لڑائی کا شاخسانہ ہے۔ آج عراق کی یہ تباہی وبربادی، اس کے آمر صدام حسین کی بے وقوفانہ غلطیوں کا خراج ہے۔ ایران / عراق جنگ، پھر جنگ خلیج کے بعد امریکی پابندیوں میں ۱۰، ۱۰ لاکھ کے قریب مسلمان ہلاک ہو گئے۔ پھر ۲۰۰۳ء میں امریکی قبضہ کے بعد ہلاک ہونے والی عراقی مسلمانوں کی تعداد ۵۰ لاکھ سے بھی تجاوز کر گئی۔ اور ایک بھرا پرا، زمینی وسائل سے مالا مال مسلم ملک تباہی وبربادی کی تصویر بنا بیٹھا ہے۔ اگر امریکہ اپنے دوستوں کے ساتھ اچھا رویہ رکھتا تو صدام حسین اس کا سب سے بڑا مستحق تھا، لیکن امریکی دوستی سراسر مفادات کی ہے جس کا مشاہدہ پاکستان کی فرنٹ لائن سٹیٹ بھی کر چکی ہے اور آئندہ بھی عراق ایسے امریکی ایجنٹ ایسے ہی انجام سے دوچار ہوتے رہیں گے۔

## عراق کی جنگ اور اقوام متحدہ

امریکہ اور برطانیہ کی عراق پر مسلط کی جانے والی جنگ میں اقوام متحدہ کی قراردادوں کا کیا حشر ہوا، اور سلامتی کونسل کا کس طرح استحصال ہوا، اس کا نقشہ بھی بڑا واضح ہے۔ اس سرکشی میں عالم کفر کے بڑے بڑے ممالک کس طرح اس کا ساتھ دیتے رہے، حالانکہ انہیں اس کے بعد اپنے اپنے ایوانوں اور عوام سے معافی بھی مانگنا پڑی۔ اقوام متحدہ ہوں یا عالمی عدالتیں، یہ صیہونی ادارے مسلمانوں پر ظلم کرتے ہوئے یکجان ہوتے ہیں، اس سلسلے میں کوئی قانون اور ضمیر کی خلش اُن کے آڑے نہیں آتی۔ ان میں بعض اگر کہیں ظلم کو برا کہہ بھی دیں لیکن آخر کار ان کا عمل ظلم کی تائید وتعاون کا ہی ہوتا ہے۔ اقوام متحدہ ان کے مفادات کا تحفظ کرنے والی وہ لونڈی ہے، جو اس دست درازی پر اُف نہیں کر سکتی، نہ ہی ان کے ظالمانہ ہاتھ کو روک سکتی ہے۔ سیکرٹری جنرل کوفی عنان اس جارحیت کے ناجائز ہونے کا واویلا مچاتا رہا، لیکن اس سے امریکہ کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ تاہم یہ عالمی ادارے اگر کمزور کوئی زیادتی کر بیٹھیں تو ان کے خلاف جابر فرعون بن کر، جبر کو قانونی جواز دینے کو آن موجود ہوتے ہیں۔ اقوام متحدہ پر یہی اعتراض ترکی کے صدر طیب اردگان نے اس کی جنرل اسمبلی میں خطاب کرتے ہوئے کیا:

"دنیا پر سلامتی کونسل کے پانچ مستقل ممبران کی اجارہ داری ہے اور پوری دنیا کی قسمت کا فیصلہ ان کی مٹھی میں ہے۔ ان کے اختیارات نہایت ہی غیر اخلاقی، غیر قانونی اور غیر جمہوری ہیں۔ ان کی بدولت

انہوں نے پوری دنیا کو غلام بنا رکھا ہے اور اپنے اشاروں پر نچا رہے ہیں۔ یہ پانچ ممالک کبھی بھی کسی دوسرے ملک کو اپنے مفادات کے خلاف قدم اٹھانے کی اجازت نہیں دیتے اور ان تمام قراردادوں کو ویٹو کر دیتے ہیں جو ان کے یا ان کے حامی ملکوں کے خلاف ہوتی ہیں۔ ان پانچ ویٹو پاور رکھنے والے ملکوں نے اقوام متحدہ پر قبضہ کر رکھا ہے اور ان میں ایک بھی مسلم ملک نہیں ہے۔ اقوام متحدہ کی طرف سے مسلم ملکوں کے مسائل حل کرنے کی ذرہ برابر بھی سنجیدہ کوشش نہیں ہوتی بلکہ حل کرنے کی بجائے اور اُلجھا دیا جاتا ہے جبکہ عیسائیت کے معاملہ میں ان کا رویہ دوسرا ہوتا ہے۔''[1]

یہ بات بھی فکر انگیز ہے کہ اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل ہی وہ مجاز ادارہ ہے جو کسی ملک کی زیادتی پر اقدام کر سکتا ہے، لیکن اس کے بجائے امریکہ و برطانیہ اپنے تئیں دوسرے ممالک پر چڑھ دوڑیں اور اقوام متحدہ خاموش بیٹھی رہی تو یہ اس کے عالمی کردار کی صریح نفی اور اس کی اہمیت کا انکار ہے۔ آج امریکہ کو طاقت حاصل ہے اور 'جس کی لاٹھی اس کی بھینس' کے ظلم پر اقوام متحدہ خاموش بیٹھی ہے تو کل اگر مسلم ممالک ایک طاقتور اتحاد بن کر امریکہ پر چڑھ دوڑیں اور اس کے صدر کو یوں ہی پھانسی کا فیصلہ سنا کر نافذ کر دیں تو کیا ان کے اس اقدام کو بھی گوارا کیا جائے گا، ایسا رویہ 'عالمی برادری' کے تصور کے سراسر انکار پر مبنی ہے۔

عراق پر امریکی جنگ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں حقیقی دہشت گرد کون ہے؟ وہ کون سے ممالک ہیں جنہوں نے ملکوں کی برادری میں بدمعاشی کو وتیرہ بنا رکھا ہے، اور نام لینے کو پہلے عراق میں انہوں نے انسانی حقوق کی پامالی کا بہانہ استعمال کر کے پابندیاں قائم کر کے ۱۰ لاکھ بچوں کو موت کے منہ میں سلا دیا، اور اب فرضی کیمیائی ہتھیار کا بہانہ بنا ڈالا۔ انسانی حقوق کا نعرہ کس کا استحصالی ہتھکنڈہ ہے، اور کون دنیا میں حقیقی ظلم کا ارتکاب کر رہا ہے؟ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے اصل مجرم کون ہیں؟ اور اپنے سامنے جائز مزاحمت کرنے والے حریت پسندوں کو بھی وہ دہشت گرد قرار دیتے ہوئے نہیں تھکتے۔ عراق پر امریکی ناجائز حملہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ تہذیب وتمدن کے نعرے لگانے والے ہی اصل دہشت گرد ہیں۔

اہل مغرب اپنے ہر اقدام کے ساتھ تکرار سے یہ کہتے ہیں کہ ہم دنیا کو بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن ان کا دنیا کو بہتر بنانا، تمام انسانوں کے بجائے صرف ان کے ہم وطنوں اور ہم نسلوں کے لئے ہوتا ہے۔ وہ اپنے سوا دوسروں کو جانوروں جیسے حقوق دینے کو بھی آمادہ نہیں ہیں۔ اخلاقیات کے بڑے معیارات کا دعویٰ کرنے والے قوموں کے مجرم اور انسانیت کے قاتل ہیں۔ اقوام متحدہ کے سابق سیکرٹری جنرل کوفی عنان اپنی سوانح عمری Interventions: a life of war and peace میں لکھتے ہیں:

---

۱ سہ روزہ 'دعوت'، دہلی، ۴/اکتوبر ۲۰۱۶ء

"اقوامِ متحدہ صدام حسین سے پر امن مکالمہ کر رہی تھی لیکن امریکہ نے بے صبری کا مظاہرہ کیا اور عراق پر حملہ کر دیا۔ جب کوفی عنان صدام حسین سے ملنے گئے تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا: 'ہم جانتے ہیں کہ بعض طاقتیں نہیں چاہتیں کہ آپ ہم سے ملیں۔' کوفی عنان کا موقف ہے کہ اگر امریکہ کچھ انتظار کرتا تو وہ جنگ روکی جاسکتی تھی۔

کوفی عنان اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھاتے ہیں کہ برطانوی اور امریکی پالیسی عراق کے لیے کچھ اور تھی اور اسرائیل کے لیے کچھ اور۔ وہ اسرائیل کی غلطیوں سے درگزر کرتے رہے لیکن عراق کو اس کی غلطیوں کی سزا دیتے رہے۔ کوفی عنان اپنی کتاب میں برطانوی لیڈر ٹونی بلیئر اور امریکی لیڈر جارج بش کی جارحیت کی سختی سے مذمت کرتے ہیں۔ کوفی عنان کی زندگی میں ایک لمحہ ایسا بھی آیا جس میں اُنہوں نے سچ بولا اور وہ اقوامِ متحدہ کی ملازمت سے برطرف کر دیے گئے۔ بی بی سی کے ایک انٹرویو کے دوران صحافی نے پوچھا: کوفی عنان! کیا امریکہ کا عراق پر حملہ غیر قانونی تھا؟

کوفی عنان نے جواب دیا: 'ہاں۔'

اس انٹرویو کے بعد کوفی عنان کے امریکی دوست Ted Sorenson نے، جو صدر کینیڈی کی تقریریں لکھا کرتے تھے، کوفی عنان کو ایک ای میل لکھا جس میں اس نے کوفی عنان کو پہلے سچ کہنے کی مبارکباد دی اور پھر یہ پیش گوئی کی کہ ایک سچے لفظ 'ہاں' کہنے کی وجہ سے وہ دوبارہ اقوامِ متحدہ کے سیکرٹری نہیں بنیں گے۔ سورنسن کی پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ کوفی عنان کو سچ بولنے کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔

کوفی عنان اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ القاعدہ، صدام حسین اور حزب اللہ عالمی امن کے لیے خطرہ ہیں لیکن وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ القاعدہ، حزب اللہ اور صدام حسین سے کہیں بڑا خطرہ اسرائیل، امریکہ اور برطانیہ ہیں کیونکہ وہ زیادہ طاقتور ہیں۔"[1]

## کفار کا طریقۂ واردات: 'لڑاؤ اور حکومت کرو'

کفار کی ساری کوششیں منافقت، جھوٹ، ہیرا پھیری اور بددیانتی پر مبنی ہیں۔ انہیں مسلم امہ سے براہ راست جنگ کرنے کی ہمت نہ پہلے تھی، نہ آج ہے۔ وہ ہمیشہ پیچھے سے چھپ کر حملہ کرتے اور فرعونی سازشیں کرتے ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرعون کی سرکشی اور چالبازی کا نقشہ یوں پیش کیا ہے:

1 http://www.humsub.com.pk/٦٦٦٤١/khalid-sohail-/٢٥

﴿ إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَ جَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَآءَهُمْ وَ يَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ ﴾ (سورۃ القصص)

"فرعون نے زمین میں فساد و سرکشی کا راستہ اختیار کیا اور اس کے باشندوں کو فرقوں میں تقسیم کر دیا، ایک جماعت کو وہ کمزور کرتا تھا، ان کے بیٹوں کو ذبح کرتا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا تھا، وہ بڑا ہی فسادی تھا۔"

تقسیم اور پھوٹ ڈال کر کسی ایک گروہ کی تائید کے ذریعے حکومت پر قبضہ جمانا، فرقوں میں بانٹنا اور مظلوموں کو دبانا فرعونی حکومت کا طریقہ ہے اور یہی مغربی طاقتوں کا وتیرہ ہے: Divide and Rule

عراق میں صدام حسین کی قیادت میں شیعہ سنّی عرصہ دراز سے اکٹھے رہ رہے تھے۔ یہی اکٹھے رہنے کے جذبات عراق پر یلغار کے وقت وہاں کے شیعہ سنّی حضرات کے بھی تھے کہ ہمیں آپس میں ٹکرانے سے بچنا ہوگا۔ سیکولر نامہ نگار وسعت اللہ خاں نے اسی دور ۲۰۰۳ء میں عراق کا دورہ کیا، اور ۲۰۱۶ء میں اپنی یادداشتوں میں لکھا کہ

"نجف میں محمد باقر الحکیم سے ملاقات ہوئی جو طویل جلاوطنی کاٹ کر تازہ تازہ ایران سے لوٹے تھے۔ اُنھوں نے دورانِ گفتگو ایسا فقرہ کہا جو آج بھی تازہ ہے 'اگر عراقی شیعوں اور سنیوں کو غیر عراقیوں نے ایک دوسرے سے بدظن نہ کیا تو ہم لبنانیوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ رہنا سیکھ لیں گے۔ بصورتِ دیگر عراق اور اردگرد کا خطہ زہریلے سانپوں میں گھر جائے گا۔" (تین ماہ بعد باقر الحکیم ایک دھماکے میں ہلاک ہوگئے)۔

آیت اللہ علی سیستانی سے پانچ منٹ کی ملاقات کا شرف ضرور حاصل ہوا۔ میں صرف ایک سوال پوچھ پایا: اب عراق کا مستقبل کیا ہے؟' جواب آیا: "امریکی جتنا جلد چلے جائیں، اتنی جلد زخم مندمل ہونے لگیں گے، ورنہ یکطرفہ پالیسیاں زخم کو ناسور بنا دیں گی۔" (امریکی اور اتحادی آٹھ برس بعد عراق سے لوٹے۔ تب تک زخم ناسور بن چکا تھا)"[1]

اسی قومی اتحاد کی تلقین صدام حسین نے روپوشی کے دوران قوم کے نام اپنے خط میں کی، ۱۴/ اگست ۲۰۰۳ء کو الجزیرہ نیٹ ورک پر صدام حسین کے خط کے اقتباسات پڑھے گئے:

"اگر عراق کے شیعہ حلقے لوگوں پر جہاد کے لئے زور دیں تو اس سے عراق کے عوام متحد ہو کر قابض افواج کے خلاف صف آرا ہو سکتے ہیں۔ اس خط میں ایک اعلیٰ شیعہ رہنما آیت اللہ علی سیستانی کے اس

---

1 بی بی سی اردو: وسعت اللہ خاں کی یادداشتیں: ۵ جولائی ۲۰۱۶ء

اعلان کا بھی خیر مقدم کیا گیا ہے کہ امریکی نگرانی میں بنایا جانے والا عراق کا آئین ناقابلِ قبول ہے۔"[1]

عراق پر ہونے والی یلغار بھی کچھ عراقی ہم وطنوں کی سازشوں کا ہی نتیجہ تھی، ان میں ایک شخص صدام حسین کا قریبی دوست، عراق کا سابق عیسائی وزیر خارجہ طارق عزیز تھا جس کا نام میڈیا میں بکثرت آتا رہا۔ یہ غدار ۲۰۱۲ء میں عراقی سپریم کورٹ سے سزائے موت پانے کے بعد جون ۲۰۱۵ء میں جیل میں ہی مر گیا۔ ایک اور غدار شخص عراقی ریاضی دان، سیاستدان، 'عراقی نیشنل کانگرس' کا سربراہ پروفیسر احمد الجلبی تھا، جو مارچ ۲۰۱۵ء میں اکہتر برس کی عمر میں طبعی موت مر گیا۔ اسی غدار نے عراق پر امریکی حملے کی لابنگ اور منصوبہ بندی کی تھی اور امریکہ کو ہتھیاروں کے متعلق غلط معلومات فراہم کی تھیں۔ جرمن خبر رساں ادارہ لکھتا ہے:

"عراق پر حملے کے بعد وائٹ ہاؤس کی طرف سے الجلبی کی حمایت میں بھی کمی آگئی تھی کیوں کہ وہ تمام معلومات غلط ثابت ہوئی تھیں جنہیں دنیا کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ عراق کے سابق حکمران صدام حسین کے نہ تو القاعدہ سے تعلقات ثابت ہو سکے تھے اور نہ ہی عراق سے بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار برآمد ہوئے تھے، جیسا کہ اس بارے میں عوامی سطح پر پروپیگنڈا کیا گیا تھا۔

احمد الجلبی نے نوّے کی دہائی میں عراق کے شمال میں کرد بغاوت کو بھی منظم کیا تھا لیکن اس بغاوت میں سینکڑوں افراد مارے گئے تھے جبکہ الجلبی خود فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اس کے بعد وہ عراق میں امریکی حملے کے بعد واپس آئے تھے۔

الجلبی امریکی حملے کے بعد عراقی گورننگ کونسل کے غیر مستقل صدر بھی بنے اور نائب وزیر اعظم کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ عارضی طور پر تیل کی پیداوار کے معاملات بھی ان کے ہاتھ میں آئے لیکن وہ کبھی بھی اس عہدے تک نہ پہنچ سکے۔"[2]

عراق پر قبضے کے لئے امریکہ نے سراسر جھوٹ کا سہارا لیا، تہذیب وتمدن کے بلند بانگ دعوے کرنے والے اس کے ساتھی برطانیہ، آسٹریلیا اور نیٹو میں انصاف کا معمولی سا احساس بھی بیدار نہ ہوا۔ اس کے بعد امریکہ نے پرانی فرعونی چال چلی کہ شیعہ سنی کے دیرینہ اختلاف کی آگ کو ہوا دکھائی اور ماضی میں بھی عراق کو اس بدترین صورتحال سے دوچار کرنے کیلئے اسی امریکہ نے صدام حسین کو استعمال کیا تھا، اس وقت صدام کو اس زیادتی اور پھوٹ ڈالنے کا احساس بھی نہ ہوا۔ چنانچہ ۱۹۹۰ء میں امریکہ نے اپنی سفارتی کوششوں کے ذریعے سب سے پہلے عراق کو کویت پر حملہ کرنے کا مشورہ دیا۔ امریکی جریدے 'فارن پالیسی' نے جنوری ۲۰۱۱ء میں

1 http://www.bbc.com/urdu/news/۰۳۰۸۱۴_saddam_letter_na.shtml

2 http://www.dw.com/ur/a-18823254

وکی لیکس کے حوالے سے ۱۹۹۰ء میں عراق میں متعین امریکی سفیر اپریل گیلیسپی کا اس بیان کا تجزیہ کیا:

In a now famous interview with the Iraqi leader, U.S. Ambassador April Glaspie told Saddam, "We have no opinion on the Arab-Arab conflicts, like your border disagreement with Kuwait.' The U.S. State Department had earlier told Saddam that Washington had 'no special defense or security commitments to Kuwait.' The United States may not have intended to give Iraq a green light, but that is effectively what it did."[1]

"ان دنوں مشہور انٹرویو میں عراقی رہنما صدام حسین کو امریکی سفیر اپریل گیلیسپی نے بتایا کہ ہم عرب اقوام کی باہمی جنگوں کے بارے میں غیر جانبدار ہیں جیسا کہ کویت کے ساتھ آپ کا سرحدی تنازعہ ہے۔ اس سے پہلے امریکی محکمہ خارجہ صدام حسین کو باور کرا چکا ہے کہ ہمارا کویت کے ساتھ کوئی دفاعی یا حفاظتی معاہدہ بھی نہیں ہے۔ اس طرح امریکہ نے عراق کو گرین سگنل تو نہیں دیا تاہم مؤثر طور سے اپنا پیغام واضح کر دیا۔"

عراق کو کویت پر جارحیت کا مشورہ عالم عرب کی جدید تاریخ میں اس خانہ جنگی کا آغاز ہے جس کا وجود اس سے پہلے عرب میں مفقود تھا۔ عراقی جارحیت کے نتیجے میں سعودی عرب میں امریکی فوج کو بلایا گیا، جہاں اس فوج کی موجودگی نے پہلے القاعدہ کے اختلاف کو پیدا کیا، اس کا وجود متحرک ہوا، پھر ۲۰۰۲ء تک یہ فوج مشرقِ وسطی میں ہی براجمان ہو گئی۔ ۲۰۰۳ء میں سعودی عرب سے جانے کے بجائے امریکی فوج ہمسایہ ملک عراق میں صدام حسین کی حکومت پر جھوٹ بول کر حملہ آور ہو گئی۔ کئی برس یہاں گزارنے کے بعد، اب چند سالوں سے یہی فوج قطر میں ڈیرے جمائے ہوئے ہے۔ سرزمین عرب میں اس فوج کی آمد کا سہرا صدام حسین کے سر جاتا ہے، جو اس کو بلانے کا سبب بنا، اور پھر اسی کا نشانہ بن گیا۔

مغرب کا پورا پیغامِ انسانیت 'باہمی ٹکراؤ' کر کے اپنے مفادات سمیٹنا ہے۔ جو ممالک ان کی کالونیاں بنے، وہاں اُنہوں نے مسلکی بنیادوں پر فرقہ پرستی کو مضبوط کیا، پھر سیاسی بنیادوں پر بعض کو مفادات دے کر دوسروں کو کمزور کر کے قوموں کی تفریق کی۔ پھر سیاسی نظاموں کے ذریعے اس قوم کو سیاسی پارٹیوں میں تقسیم کر کے ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار کر دیا۔ کہیں مزدور کو آجر کے مقابل منظم کر دیا، کہیں عورت کو مرد کے مقابل لا کھڑا کیا۔ ایک ہی ملت کو دسیوں ملکوں میں بانٹ دیا۔ ان میں قیادت و ناموری اور مفادات کا ایسا صور

1 http://foreignpolicy.com/2011/01/09/wikileaks-april-glaspie-and-saddam-hussein/

پھونک دیا کہ اب ایسے معاشرتی ناسوروں سے جان چھڑانا بڑا مشکل ہو چکا ہے۔ معاشرے کے مختلف طبقات کو بانٹنے کے بعد ان کی ڈوریاں ہلانا اور ان کو اسلحہ فروخت کرنا اور ان میں موت بانٹنا مغرب کا وہ انسانیت نواز پیغام ہے جس پر داد و تحسین کی توقع کی جاتی ہے۔ جو مسلمان بھی اس ٹکراؤ کا راستہ چنتا ہے، اسے جان لینا چاہیے کہ وہ شیطان اور کفر کی چالوں کا شکار ہوتا ہے۔

عراق پر ہونے والی بدترین ہلاکت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دنیا آج بھی مفادات کی اسیر ہے، اور ظلم کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہیں، کیا عراق پر جھوٹ کے نتیجے میں ہونے والے سنگین مظالم کے بعد ہالینڈ اور آسٹریلیا کا فرض صرف معافی مانگنا ہی ہے، یا حقیقی معافی ان سے اس ظلم کے خاتمے کے لئے کوششوں کا بھی مطالبہ کرتی ہے، جس کا کوئی تصور بھی موجود نہیں۔ دراصل خونِ مسلم کی ارزانی پر سارے کافر ہی دل میں خوشیاں مناتے ہیں۔ یہی وہ ظلم واستبداد ہے جو اس دور میں انسانیت کا اصل مسئلہ ہے اور اسی سے شیطانی مقاصد پورے ہو رہے ہیں۔ کیا امریکہ و برطانیہ کے اس صریح اقرار کے باوجود بھی اس مہذب دنیا میں ایسا کوئی امکان ہے کہ اس ظلم کا کوئی مداوا اور تاوان ادا کیا جائے۔ نہیں بالکل نہیں بلکہ ایسا کرنے والے مزید شکار تاکتے رہتے ہیں، دنیا خاموش بیٹھی دیکھتی ہے اور ان کے ساتھی اپنا حصہ وصول کرنے کو آن موجود ہوتے ہیں۔ یہی دنیا کا اصل اور سنگین ترین المیہ ہے، اور اسلام کی نعمت کو ترک کر کے دنیا نے یہی خسارہ اٹھایا ہے۔ کیا دنیا کو سائنسی سہولیات دینا اہل مغرب کا احسان ہے، یا دنیا میں بدمعاشی کے ذریعے موت وہلاکت بانٹنا ان کا بدترین جرم ہے۔ ہمیشہ سے اہل استعمار ایسے ہی جرائم کرتے آئے ہیں۔

کفر کیلئے سب مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں اور وہ سب سے بدترین نفرت کرتے ہیں۔ اگر وہ کسی کو ایجنٹ بناتے ہیں تو عراق کے صدام حسین کی طرح وقت آنے پر اسی کو نشانِ عبرت بھی بنا دیتے ہیں۔ اگر کوئی ملک ان کی تائید سے مسلم امہ کو اختلاف سے دوچار کرتا ہے تو اسے اس آلہ کاری سے عقل مندی اور ملی بصیرت سے ابھی جھٹک دینا چاہیے۔ جس طرح ملت اسلامیہ کو نظریاتی اور فقہی بنیادوں پر فرقہ واریت کی مذمت کرنی چاہیے، اسی طرح سیاسی فرقہ واریت (قومیت) کو بھی ٹھکرانا چاہیے اور ساری دنیا میں ایک ملت بن کر جینا چاہیے، جن کے مفادات ایک ہیں۔ اگر یہ نہیں تو دنیا کا کفر انہیں مشترکہ دشمن جانتا ہے اور وہ خود قومیتوں کو بھلا کر کبھی نیٹو، کبھی اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل، کبھی ریاستہائے متحدہ امریکہ اور کبھی یورپی یونین، کبھی جی ۲۰ جیسے ناموں سے مشترکہ پیش قدمی کرتا ہے۔ ان عالمی اداروں کے مسلمانوں کے خلاف جذبات اور اقدامات اب ڈھکے چھپے نہیں۔ عراق پر بدترین ظلم کے اعتراف کے بعد بھی یہ نام نہاد عالمی انصاف کے ادارے کچھ کرنے کو آمادہ نہیں بلکہ ظالم کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں کے باہمی اتحاد کے بغیر کیا کوئی چارہ باقی رہ جاتا ہے؟! کاش اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی سیاسی قیادت اور خواص وعوام کو اس کا شعور اور بصیرت عطا کر دے۔